جلد:۵، شمارہ:۴
اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۸ء

ISSN : 2394-5567
S.No. 16

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER
October-December 2018
S.No. 16

ISSN : 2394-5567
S.No. 16

Vol.: 5, Issues : 4
October-December 2018

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 (UGC No. 47011) S.No. 16

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؒ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

جلد۔۵ شمارہ۔۴

اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۸ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر عبدالقادر جعفری، الہ آباد

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، صدر شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت ڈگری کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ	ازلان حیدر	۴
۲	سرسید اور مولوی نیاز محمد کے روابط	ڈاکٹر محمد قمر عالم	۵
۳	علامہ اقبال لاہوری کی شاعری میں کشمیریت کا عنصر	ڈاکٹر جہانگیر اقبال	۱۱
۴	علامہ شبلی کی فارسی غزل سرائی	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۱۵
۵	امیر خسرو کی شاعری کے چند نمایاں پہلو	ڈاکٹر توصیف خان کاکر	۲۲
۶	آخری مغلیہ عہد میں فارسی علم وادب	ڈاکٹر تنویر حسن	۲۶
۷	امیر خسرو کی مثنویوں میں ہندوستان	ڈاکٹر محمد عمر	۳۳
۸	عصر حاضر میں تصوف شاہ ولی اللہ کی معنویت	اظہار احمد	۳۷
۹	پیر غلام حسن کھویہامی اور تاریخ حسن	منظور بھٹ	۴۱
۱۰	دربار ہمایوں میں جوہر آفتابچی کی خدمات	محمد لطیف	۴۸
۱۱	علامہ آزاد بلگرامی کی تذکرہ نگاری	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین	۵۲
۱۲	نظام الملک آصف جاہ۔ حیات اور کارنامے	سعدیہ سنبل	۵۷
۱۳	منشی نول کشور بحیثیت مورخ اور تواریخ نادر العصر کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ثنا کوثر	۶۱

English Articles:

1. Introduction of Tazkira-i-Ilahi
   Abdul Rahman Ansari 3
2. Problems of evil in muslim philosophy
   Sadaf Fatima 9
3. A brief survey of Tarikh-i-Farah Bakhsh
   Dr. Md. Irshad Alam 21

اداریہ

دبیر کا یہ سولہواں (۱۶) شمارہ **اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۸ء** شائع ہوکر آپ قارئین کے ہاتھوں میں اس شمارے کے ساتھ پانچویں (۵) جلد کا اختتام ہوا اور خوب وہ تمام لوگ جنہوں نے اس جریدہ کے لئے ادبی معاونت کی اور وہ تمام جنہوں ذوق وشوق کے ساتھ استفادہ کیا اور ادارت سے لے کر اشاعت تک جو بھی خامیاں ہوئیں ان کی نشاندہی بھی کی میں ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔اور امید کرتا ہوں آگے بھی انشاءاللہ ایسی ہی ادبی معاونت، خامیوں کی نشاندہی اور حوصلہ افزائی حاصل رہے گی۔

شمارہ ہذا اپنے مندرجات کے اعتبار سے کئی معنوں میں بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ سب سے پہلا مقالہ محسن ملت، بانی درسگاہ علی گڑھ، مرتب تاریخ فیروز شاہی وتزک جہانگیری، مصنف آثار الصنادید جناب سرسید احمد علیہ رحمہ پر بعنوان **''سرسید اور مولوی نیاز محمد کے روابط''** ہے۔اس کی اہمیت اس شمارہ میں اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہی ہے کہ اسی ماہ اکتوبر کی ۱۷ تاریخ کو موصوف کا یوم ولادت ہے۔اس کے بعد دوسرا مقالہ عظیم مفکر اسلام قومی وملی شاعر علامہ سر محمد اقبال پر بعنوان **''علامہ اقبال لاہوری کی شاعری میں کشمیریت کا عنصر''** ہے، علامہ اقبال کا یوم ولادت بھی ۹ نومبر کو ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں مشہور خاص وعام شخصیت کے یوم ولادت کے اعتبار سے ان پر لکھے گئے مقالات کی اشاعت اس شمارہ کی خاصیت ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد کے **مقالات علامہ شبلی کی فارسی غزل سرائی، امیر خسرو کی شاعری کے چند نمایاں پہلو، آخری مغلیہ عہد میں فارسی علم وادب، امیر خسرو کی مثنویوں میں ہندوستان، عصر حاضر میں تصوف شاہ ولی اللہ کی معنویت، پیر غلام حسن کھویہامی اور تاریخ حسن، دربار ہمایوں میں جوہر آفتابچی کی خدمات، علامہ آزاد بلگرامی کی تذکرہ نگاری، نظام الملک آصف جاہ۔حیات اور کارنامے اور منشی نول کشور بحیثیت مورخ** اپنے عنوان سے ہی اپنی اہمیت کی شہادت دے رہے ہیں۔

جریدہ کے انگریزی کے حصہ میں پہلا مقالہ تذکرہ الٰہی کا تعارف جس کا تعلق شیراز جونپور سے ہے، دوسرا مقالہ علامہ اقبال اور امام غزالی کے اعتبار سے اسلامی فلسفہ میں برائیوں پر بحث کی گئی ہے، اور تیسرا مقالہ میں منشی سیو پرساد کی تاریخ فرح بخش کا تعارف پیش کیا ہے۔اس طرح اردو اور انگریزی دونوں حصہ کے مقالہ اپنے عنوان کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر محمد قمر عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سرسید اور مولوی نیاز محمد کے روابط
(خطوط سرسید کے حوالے سے)

سرسید احمد خان نے تمام عمر قوم کی فلاح و بہبود میں ایک جانب بذات خود کار ہائے گراں انجام دئے وہیں دوسری جانب انکے رفقاء کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے دستیاب ہے جنہوں نے سرسید کے شانہ بشانہ انکی ہر طرح سے کمک فرمائی۔ سرسید کے ان رفقاء میں سرفہرست نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، حالی، شبلی و دیگر اسمائے گرامی عوام الناس میں بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی چند ایسی عظیم ہستیاں تھیں جنہوں نے سرسید احمد خان کی تمام تعلیمی و اصلاحی تحریکوں میں ہر ممکن مدد فرمائی ان میں سے ایک بہت اہم نام پنجاب کے معروف وکیل مولوی نیاز محمد خان کا ہے۔ مقالہ ہذا میں سرسید احمد خان اور مولوی نیاز محمد خان کے روابط اسماعیل پانی پتی کے مرتب کردہ مکتوبات سرسید کے حوالے سے منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔

صوبہ پنجاب کے موضع دھوگڑی ضلع جالندھر کے نامور رؤساء میں شمار مولوی نیاز محمد خان صاحب سرسید احمد خان کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے۔ نیاز محمد خان سرسید سے نہایت محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ اسمٰعیل پانی پتی لکھتے ہیں کہ:

''ان صاحب کا نام پہلے 'غلام نیاز خان' تھا سرسید سے ملنا جلنا ہوا تو انھوں نے اس کو ناپسند کیا۔ اس لئے انھوں نے سر سید کی منشاء کے مطابق اپنا نام 'نیاز محمد' رکھ لیا.....''[1]

آپ دونوں حضرات کے درمیان علمی و مذہبی مسائل سے متعلق مسلسل خط و کتابت رہتی تھی، مولوی نیاز صاحب ہمیشہ مدرسۃ العلوم کو مالی امداد فرماتے، ہر ممکن مدد کرتے تھے اسی نسبت سے سرسید بھی ان کا بیحد خیال رکھتے اور اکثر احوال پرسی کے لئے خطوط تحریر فرماتے تھے۔ شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے مولوی نیاز محمد اور سرسید کے درمیان تحریر کئے گئے تقریباً ۴۳ر خطوط 'مکتوبات سرسید میں' شامل کئے ہیں۔ حقیقت میں یہ تمام خطوط سرسید احمد خان کی تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسمٰعیل پانی پتی کے متعلق خطوط کی اتنی تعداد سرسید کے کسی عزیز سے عزیز دوست کی بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرسید نے نیاز محمد کو اپنے تمام خاص دوستوں سے زیادہ خطوط لکھے۔ مختلف حادثات اور دیگر وجوہات کے سبب سرسید کے دیگر خاص دوستوں کے پاس خطوط محفوظ نہیں رہے اس کے برعکس مولوی نیاز محمد صاحب نے ان خطوط کو بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا جس کی وجہ سے یہ قیمتی دستاویز آج ہم سب کے سامنے موجود ہیں۔

مولوی نیاز محمد خان محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی بھی رہے ہیں، سرسید نے ان کی مالی امداد کی بنا پر ۱۸۹۷ء میں کالج کا ٹرسٹی مقرر فرمایا تھا۔ جس کی تصدیق سرسید کے اس خط سے ہوتی ہے۔ مضمون ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے بہ وجہ اشد ضرورت کے جس کا بیان میں نے اپنی تجویز میں کیا ہے آپ کو حسب دفعہ ۱۴۰/اختیار قوانین ٹرسٹیان کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا بہ شرط آپ کی منظوری کے ٹرسٹی مقرر کیا ہے۔ اس لئے کہ مجھ کو آپ سے امید ہے کہ آپ میری زندگی میں اور نیز میرے بعد کالج کی خیر خواہی اور اس کی ترقی و استحکام میں بہ دل و جان سعی اور کوشش فرماتے رہیں

گے۔‘‘

خاکسار

سید احمد

لائف آنریری سکریٹری ٹرسٹیان، ایم.اے.او کالج

مورخہ ۱۶؍جنوری ۱۸۹۷ء علی گڑھ [۲]

مولوی نیاز محمد خان نے تاعمر مدرسۃ العلوم علی گڑھ، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی مالی مدد فرمائی، سرسید نے جب علی گڑھ میں مسجد کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا تو تعمیر میں پیش آنے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لے انھوں نے ماہانہ رقم مقرر کی۔ اپنے تمام احباب کو اس ماہانہ رقم کی ادائیگی کے لئے ہموار کیا تھا مولوی نیاز محمد خان نے بھی دو یا تین سال تک ماہانہ رقم مسجد کی تعمیر میں عطا فرمائی تھی۔ مولوی نیاز محمد نے تمام عمر سرسید کے علمی کاموں میں مدد فرمائی۔ ہر کام میں سرسید کے معاون و مددگار رہے۔ سرسید کی طرح انھوں نے بھی تمام عمر قوم وملت کی خدمت میں بسر کی۔

سرسید احمد خان کی شخصیت، ان کے مزاج، ان کے طریقۂ کار سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ یہاں میں مولوی نیاز محمد خان کو تحریر کئے سرسید کے ایک خط کے ذریعے سے ان کی شخصیت، بے باک طبیعت اور اپنے کام میں رواداری و ایمانداری کا ایک نمونہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرونگا۔ ایک مرتبہ سرسید سے نا اتفاقی رکھتے ہوئے مولوی سمیع اللہ خان صاحب نے ایک نئی انجمن پنجاب میں بنانے کا ارادہ کیا۔ لوگوں کو ہموار کیا جس کی خبر سرسید کو ہوئی تو انھوں نے بڑے بے باک انداز میں سمیع اللہ خان سے دوستانہ روابط قطع کئے۔ پورے واقعہ کو سرسید کی زبانی آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

’’مخدومی مکرمی! ان لغو اور بیہودہ باتوں پر خیال کرنا اور ان کے پیچھے پڑھنا اور اخباروں میں جواب وسوال لکھنا میں پسند نہیں کرتا، حاجی.....میرے بے تکلّف دوست ہیں، مگر بعض اسباب ایسے واقع ہیں جن کی سبب سے انھوں نے یہ تکلف مجھ سے کیا کہ گو مجھے نہایت افسوس ہے مگر بعض امور کے سبب میں مولوی سمیع اللہ خان کی رائے سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ میں نے ان کو کہا کہ تم کو اپنی رائے کا اختیار ہے جو چاہے لکھو مگر مولوی سمیع اللہ خان صاحب کو لوگوں کا مجمع کرنا اور مخالف پارٹی کرنا چاہتے ہیں اس مخالفت میں تم کو شریک ہونا بے جا ہے مگر وہ کسی وجہ سے شریک ہوئے۔ اس کے بعد جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ خان صاحب میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کہ نہیں ہے۔ آپ رئیس ہیں، جب کہیں ملاقات ہوگی میں آپ کی تعظیم کرونگا۔ آپ ممبر کمیٹی کے ہیں جب اجلاس میں آپ تشریف لاوینگے آپ کا ادب کرونگا لیکن میں آپ سے دوستانہ جو ملاقات تھی وہ راہ ورسم رکھنی نہیں چاہتا۔ پس دوستانہ طریقۂ ملاقات وراہ ورسم مجھ سے اور آپ سے نہیں ہے....‘‘ [۳]

محترم حضرات، غور فرمائیں کہ کتنی بے باک اور صاف گو شخصیت کے حامل تھے سرسید احمد خان، خدا ہم تمام قوم کے ذمہ داران کو ایسی امانت و دیانت داری اور بے باکی سے قوم کی خدمت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ اسی مناسبت سے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

نازاں فنِ تفسیر تھا جس پر وہ مفسر — تقریر میں ایک سحر تھا جس کی وہ مقرر
تھا رنگ زمانہ سے جو واقف وہ مبصر — لیتی تھی سبق جس سے سیاست وہ مدبّر
گویائی تھی تصوری میں جس کی وہ مصوّر — اعجاز تھا تحریر میں جس کی وہ محرر
افکار میں تعمیر تھی جس کی وہ مفکر — دل ہلتے تھے تکبیر سے جس کی وہ مکبّر

سرسیّد احمد خان اور جناب مولوی نیاز محمد خان کے درمیان تعلقات بہت وسیع تھے۔ آپ حضرات ایک دوسرے کے ہر

کام میں مددگار رہتے تھے۔علمی وانتظامی بحثوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ذاتی کاموں میں بھی فکرمند رہا کرتے تھے۔ ۶؍فروری ۱۸۹۷ء کوتحریر کئے گئے سرسید کے ایک خط کوملاحظہ فرمائیں:

''مشفق مکرمی! آپ کا عنایت نامہ دردانگیز پہنچا، جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے لیکن امر لاعلاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان اسی میں غلطاں و پریشان رہے اور سب کاموں کو جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا چھوڑ بیٹھے.....''[۴]

اس خط کو پورا اور بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نیاز محمد خان صاحب کی پہلی زوجہ اس دنیا سے رحلت فرما گئیں تھیں اور آپ اکیلے زندگی بسر کررہے تھے۔ساتھ ہی بیماری میں بھی مبتلا ہوگئے والدہ ماجدہ نے فکر کرتے ہوئے نیاز خان سے اصرار کیا کہ بیٹے آپ دوسرا نکاح فرمالیں تا کہ بیماری میں آپ کی اچھے سے خدمت ہو سکے۔آپ کی بقیہ عمر سکون اور آرام کے ساتھ گزرے گی۔سرسیّد صاحب کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بھی مولوی نیاز محمد کو سمجھاتے ہوئے فرمایا:

''میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جن کا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے۔آپ ان کی صلاح کو مان لیں اور شادی کرلیں۔امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آئندہ درست ہوجاوے گی ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے برخلاف نہیں ہے.....''[۵]

سرسیّد نے نیاز محمد کو اس امر کو بروئے کار لانے کے لئے آن حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش کی کہ آن حضرت کو بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے نہایت محبت تھی اسکے بعد آپ نے بھی نکاح فرمایا۔اگر آپ دوبارہ نکاح کرنے کو بداخلاقی تصور کرتے ہیں تو غور فرمائیں رسول اللہ سے زیادہ باخلاق کوئی دوسرا شخص تو مسلمانوں کے درمیان نہیں ہے۔میری رائے میں آپ بھی اس عمل کو انجام دے کر بقیہ زندگی سکون اور آرام سے گزاریں۔سرسید بڑا مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے اس خط کو یوں ختم فرماتے ہیں کہ:

''میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور ان کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا چاہئے۔یہ بات تمام اخلاقوں اور عبادتوں اور کانشنس کے جذبوں سے افضل ہے، والسلام.....''[۶]

اسماعیل پانی پتی کی مرتب کردہ ''مکتوبات سرسید'' میں شامل ان خطوط میں سب سے پہلا خط ۲۹؍جولائی ۱۸۸۶ کو تحریر کیا گیا ہے۔جس میں سرسید نے مولوی نیاز محمد کو بڑے بے تکلف انداز میں مخاطب کیا۔خط کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''مخدومی! اسی وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا، آپکی طبیعت کیسی ہے؟ اور کیوں اس قدر زندگی سے ناامیدی ہے؟ اگرچہ میر دانست میں مرنے کے بعد بہ نسبت زندگی کے زیادہ راحت ہے.....''[۷]

سرسید کا رقم کردہ یہ خط ایک بہت اہم موضع کی جانب روشنی ڈالتا ہے۔انسانی روح سے متعلق کئی اہم نکات پیش کئے ہیں۔جسم اور روح کی اصلیت اور اہمیت کی وضاحت کی ہے۔اس ایک چھوٹے سے خط میں سرسید نے اہم موضوع سے متعلق کامیاب اور کارآمد باتیں تحریر فرمائی ہیں۔

مولوی نیاز محمد خان سے سرسید ہر ایک اہم موضوع سے متعلق گفتگو فرماتے اور ان کی رائے کو عمل میں لاتے تھے۔اسی طرح نیاز محمد خان بھی سرسید کو اسی عزت اور محبت سے نوازتے تھے۔مولوی مراد علی، منشی محرم علی چشتی، خان بہادر برکت علی خان، اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن اسلامیہ لاہور اور محمڈن نیشنل کانفرنس سے متعلق ایک اہم خط سرسید صاحب نے مولوی نیاز محمد خان کو تحریر فرمایا۔جس سے ہم قارئین کو نہایت اہم اطلاعات حاصل ہوتی ہیں۔

مولوی نیاز محمد صاحب نے مراد علی صاحب کے ساتھ مل کر قومی اتفاق کی تجویز رکھیں مگر سرسید نے فرمایا یہ شاید خدا کو منظور نہیں کیوں کہ منشی محرم علی کو سرسید نے بحیثیت دوست مفید مشوروں سے نوازا باوجود اس کے اپنے محسن خان بہادر برکت علی کے خلاف

اخبار میں خبر چھاپی۔ سرسید صاحب نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن اسلامیہ لاہور کو مل جل کر کام کرنے کی تجویز پیش کی لیکن بعض دوستوں کو یہ پسند نہیں آئی۔ یہ خط ان تمام اہم اطلاعات سے بھرپور ہے۔ یہ ایک طویل خط چار صفحات پر مشتمل ہے۔ چند سطور آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی سعادت چاہونگا، سرسید فرماتے ہیں:

''اب آپ کے سوالات کا جو آپ نے مہربانی سے پوچھے ہیں جواب دیتا ہوں کہ محمڈن نیشنل کانفرنس کے جلسہ میں شریک ہونگا یا نہیں؟ ان کی طرف سے کوئی ایڈرس لونگا یا نہیں؟ اسکے جواب سے پہلے آپ یقین کرلیں کہ میرے جواب کو آپ انجمن اسلامیہ لاہور کی طرفداری پر محمول نہ کریں، جب میں کلکتہ میں تھا تو خود مولوی امیر علی صاحب میرے پاس تشریف لائے اور نہایت دلائل اور اسرار سے چاہا کہ میں محمڈن نیشنل کانفرنس میں شریک ہوں مگر میں نے انکار کیا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے مقاصد سے متفق نہیں ہوں۔ میری رائے میں مسلمانوں کو کسی قسم کا پولیٹیکل ایجی ٹیشن اختیار کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ کوئی شخص ہندستان میں پولیٹیکل ایجی ٹیشن اختیار کرسکتا ہے۔ آپ بھی جب سنیں گے کہ پولیٹیکل ایجی ٹیشن کیا شئی ہے اور کون شخص اس کو کرسکتا ہے اور اس کے اصول کیا ہیں تو مجھے امید ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ پس ایسی صورت میں نہ میں ان کی مجلس میں شریک ہوسکتا ہوں اور نہ اس مجلس سے ایڈرس لے سکتا ہوں۔ الّا دوستانہ طور پر منشی محرم علی صاحب سے ملنے کو جانے میں مجھے کچھ عذر نہیں ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر فرصت ہوئی اور انھوں نے بھی پسند کیا تو میں ان کے گھر ملنے کو جاؤنگا۔[۸]

سرسید بڑے بے باکانہ انداز میں اپنی بات واضح کرتے ہیں، اپنے پورے پروگرام کو بڑے سلیقے کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں، کس تاریخ کو علی گڑھ سے چلیں گے، کب پنجاب میں داخل ہونگے اور وہاں سے علی گڑھ کے لئے واپسی کرینگے، سرسید لکھتے ہیں:

''مولوی مراد علی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے آپ نے دیکھا ہوگا میں کیوں کر یہ لکھ سکتا ہوں کہ میں نہ صرف انجمن اسلامیہ لاہور کا مہمان ہوں بلکہ کل پنجاب کے مسلمانوں کا مہمان ہوں..... کبھی خاص یا عام مسلمانوں نے یا کبھی انجمن اسلامیہ لاہور نے ہم کو طلب نہیں کیا۔ اشتہار جاری ہوئے کہ کون اور کس مقام پر ایجوکیشنل کانگریس کا انتظام کریگا۔ انجمن اسلامیہ لاہور نے خط دعوت بھیجا وہ مشتہر کیا گیا اور کئی مہینے تک انتظار رہا کہ اور کوئی کچھ لکھے۔ آخر کار ممبروں سے رائے پوچھی گئی۔ سب نے منظور کیا..... میرا ارادہ ہے کہ پچیسویں دسمبر کو میل ٹرین میں یہاں سے روانہ ہوں، چھبیسویں کو رات آٹھ نو بجے وہاں پہنچ جاؤں اور تیسویں دسمبر کو وہاں سے روانہ ہوں۔ اکتیس کو علی گڑھ پہنچ جاؤں انشاءاللہ تعالیٰ۔''[۹]

سرسیّد احمد خان نے مدرسۃ العلوم کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ایک گروپ اپنے اہم رفقاء کا تیار کیا اور چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے ایک گروپ اپنے اہم رفقاء کا تیار کیا اور پنجاب میں جگہ جگہ چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے سفر کیا۔ باشندگان پنجاب نے سرسید کا سرزمین پنجاب میں اس طرح استقبال کیا:

آ گیا وہ سید والا ہم — قوم پر جس نے کیا لطف و کرم
اس کے استقبال کو جاتے ہیں ہم — گا رہے ہیں یہی نغمہ دم بدم
ویلکم اے عالی جناب ذی حشم — سید احمد خان بہادر ویلکم
خیر مقدم اے حکیم درد مند — خیر مقدم نیک خو نیکی پسند
قوم غم میں ہو چلی تھی پائے بند — دستگیری کر، نہیں پہنچے گزند
ویلکم ای عالی جناب ذی حشم
سید احمد خان بہادر ویلکم

ای رسول اللہ کے لخت جگر اے بتول پاک کے نور بصر
اے مسلمانوں کے بوڑھے راہبر ہم سبھوں کو لانے والے راہ پر
ویلکم ای عالی جناب ذی حشم
سید احمد خان بہادر ویلکم
اے سول سروس کے خواہاں مرحبا مغربی علموں کے جویاں مرحبا
حامی قوم مسلمان مرحبا سب یہی کہتے ہیں ہر آن مرحبا
ویلکم ای عالی جناب ذی حشم
سید احمد خان بہادر ویلکم

فارسی کے ایک پنجابی شاعر نے بھی اپنے الفاظ میں سرسید صاحب کا اس طرح سے استقبال کیا:

چو مخدوم منا سیدی نجم ھند کہ بھبود قوم جویند ھر دم
فزودند اعزاز و عزّو شرف بہ لاھو ر و اقطاع وی از قدم
دلم وقت رونق فروزی شان بگفتا کہ ای رھنما خیر مقدم

سرسید اپنے دوست مولوی نیاز محمد سے کہتے تھے کہ آپ کو مدرسۃ العلوم کی ترقی وتعمیر کیلئے بھی چندہ فراہم کرنے میں ہماری مدد کرنی چاہئے۔ ہمارے پاس رقم کم ہے اور بغیر روپیہ کے سارے کام بند ہو جائیں گے اور قوم کی تعلیمی ترقی کی ہماری تمام تدبیریں فیل ہو جائیں گی۔ مدرسہ کے طالب علموں کیلئے نئے بورڈنگ ہاؤس تیار کرنے کی اہم ضرورت ہے کیونکہ اب طلباء کی تعداد بڑھ رہی ہے خاص کر صوبۂ پنجاب سے بڑی تعداد میں طلباء ہمارے یہاں داخل ہو رہے ہیں۔ سرسید مولوی نیاز محمد خان سے کہتے ہیں کہ:

''فرمایئے کہ جالندھر میں اگر ہم خود آویں تو کیا نتیجہ ہوگا اور آیا وہاں آنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اور کچھ امید ہے یا نہیں، ہم نے بغرض فراہمی چندہ پنجاب کے دورے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ کی اس میں کیا رائے ہے اور کیا صلاح ہے اور کن کن ضلعوں میں ہمارا جانا مناسب ہوگا۔ ایک مضمون بہ طلب امداد ارکان پنجاب سے جو اخبار میں چھپا ہے آپ نے دیکھا ہوگا.....''[10]

سید حامد کے انتقال کے بعد سے سرسید بہت رنجیدہ ہو گئے تھے مگر ایسی حالت میں بھی آپ نے صبر سے کام لیا خدا کا شکر ادا کیا اور حالات سے سمجھوتہ فرمایا۔ قوم کا درد سرسید کے دل سے نہیں گیا ہر مشکل میں آپ اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تعلیم وترقی کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے، مولوی نیاز محمد خان نے سید حامد کے انتقال کے بعد سرسید کی خدمت میں تعزیت بھیجی تھی جس کے جواب میں سرسید نے ایک خط ان کو تحریر فرمایا جو کہ سرسید کے صبر وتحمل کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے، غور فرمائیں سر سید کہتے ہیں:

''مخدومی مکرمی نیاز محمد خان صاحب! آپکا تار ہمدردی کا پہنچا۔ جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اس کا میں صرف شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں اس کو نہایت محبت اور قدر سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے۔ پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو...''[11]

محترم حضرات، اب میں آپ کے سامنے سرسید احمد خان اور مولوی نیاز محمد سے متعلق ایک اور اہم خط سے چند اہم اطلاعات پیش کرنا چاہتا ہوں، جس کے ذریعہ سے ہمکو سرسید مرحوم بحیثیت ایک مشفق دوست، ماہر امراض اور ایک سچے حامیٔ دین

کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ مولوی نیاز محمد صاحب 'مراق' (Hypocondria، جنونی، سودابی مزاج) کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور اس مرض کی خبر ان ہوں نے سرسید کو بھی دی۔ مولوی صاحب بہت رنجیدہ اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ سرسید نے آپ کو خط تحریر فرمایا اور بڑے مخلصانہ انداز میں کہا:

''محبّی ومکرمی منشی نیاز محمد خان صاحب آپ کا عنایت نامہ اور منی آرڈر ۱۵ روپیہ بابت چندہ مسجد پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا۔ آپ کی علالت طبع سے افسوس ہوا مگر آپ یقین رکھئے کہ خدا تعالیٰ بہت جلد صحت کامل عطا فرمائیگا۔ میں بھی دعا کرونگا اور کرتا ہوں....''[۱۲]

سرسید کے تحریر کردہ اس خط کے ذریعہ سے ہم کو اس مرض کے روحانی علاج کا اہم نسخہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے سرسید کی روحانی طریقۂ علاج میں پسندیدگی اور دلچسپی کی دلیل بھی حاصل ہوتی ہے۔ سرسید اپنے دوست کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو ہر وقت کلمہ توحید کا ورد کرنا چاہئے تا کہ آپ کا اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو، مسلمان کے دل پر لا الہ الا اللہ محمّد الرسول اللہ کا نقش ہوتا ہے اسلئے کسی بھی مسلمان کا خاتمہ بخیر ہونے پر ہم کو شک نہیں ہونا چاہئے۔ 'مراق' کے مرض کے علاج کے لئے جو نسخہ مولوی نیاز محمد کو تجویز کیا اس کے بارے میں سرسید یوں رقم طراز ہیں:

''ہمارے خالہ زاد ایک بھائی تھے ان کو نہایت درجہ کا مراق تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہائے ہائے کر کے چلّایا کرتے تھے۔ ایک نہایت بزرگ نے ان سے کہا کہ میاں تم خود ہر روز سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کر لیا کرو اور دل پر پھونک لیا کرو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور صحت کامل ہوگئی۔ وہ ہمیشہ وہ سورۃ پڑھ لیا کرتے تھے اور پھر ان کو کبھی مراق نہیں ہوا۔ تم بھی ایسا ہی کرو خدا صحت دے گا.....''[۱۳]

آخر میں بس یہ ہی کہنا چاہونگا کہ سرسید کے تحریر کردہ یہ ۴۳ رخطوط مولوی نیاز محمد صاحب نے محفوظ کر کے سرسید اور ان کی تحریک کے باب میں ایک بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہ تمام خطوط تاریخی، تہذیبی، قومی حیثیت کے ساتھ ساتھ ادبی اہمیت کے بھی حامل ہیں، ان خطوط کے ذریعہ سے ہمکو اردو زبان وادب میں بھی نئی نئی جہتیں اور تراکیب کا اضافہ نظر آتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ تمام خطوط نہ صرف سرسید اور مولوی نیاز محمد خان کی دوستی کے ثبوت ہیں بلکہ ایک تاریخی اور ادبی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ آخر میں سرسید کی بان میں نظم کردہ ان فارسی اشعار پر مقالے کو ختم کرنے کی سعادت چاہونگا:

خیر خواہ ملک و ملت زندہ باش با ہمہ خوبی و صحت زندہ باش
زندہ باش ای نیک طینت زندہ باش بر سرما تا قیامت زندہ باش

حواشی:

۱. مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء، ص-۳۹۵
۲. ایضاً، ص-۴۵۴
۳. ایضاً، ص-۴۰۴
۴. ایضاً، ص-۴۵۵
۵. ایضاً، ص-۴۵۵
۶. ایضاً، ص-۴۵۵
۷. ایضاً، ص-۳۹۶
۸. ایضاً، ص-۴۰۰
۹. ایضاً، ص-۴۰۱
۱۰. ایضاً، ص-۴۱۲
۱۱. ایضاً، ص-۴۱۳
۱۲. ایضاً، ص-۴۵۷
۱۳. ایضاً، ص-۴۵۷

ڈاکٹر جہانگیر اقبال
شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی
کشمیر

علامہ اقبال لاہوری کی شاعری میں کشمیریت کا عنصر۔ایک مطالعہ

ایک بے بدل مفکر، لامثل شاعر، عظیم فلسفی اور معتمد محقق علامہ محمد اقبال لاہوری کا تولد سیالکوٹ میں ہوا۔ گوکہ ان کی زندگی ،افکار اور اشعار پر سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالہ جات تحریر کئے جا چکے ہیں مگر ہنوز ان کے آبا و اجداد اور خاندان کے بارے میں عقلی اور قیاسی دلائل سے ہی کام لیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر کی سرزمین جنت نظیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس آب وگل نے شاعر مشرق جیسی کثیر الجہت شخصیت کے اجداد کو اپنے دامن امان میں پالا ہے۔

علامہ اقبال کے انتقال کو تقریباً ۸۰ سال کا عرصہ گزر چکا ہے ان سالوں میں شاعر مشرق کی شاعری، فن، شخصیت اور فکر پر ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بے شمار کتابیں اور مقالے منظر عام پر آئے۔ علامہ نے اپنی شاعری سے صبح قیامت تک قارئین کے فکر کا ایسا سمندر میسر کیا جس کی تہہ سے انمول موتی چنے جا سکتے ہیں اقبال نے اپنے وطن اسلاف کشمیر کے تئیں اپنی محبت کا ذکر یوں کیا ہے۔

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است (۱)

علاوہ ازیں اپنے آبائی وطن کے بارے میں علامہ نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو لکھے گئے ایک خط میں بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ نے واقعات کے حوالے سے بابا لولیؒ کا ذکر کیا ہے جن کو متعدد محققین نے علامہ کے آباء میں شمار کیا ہے۔ بقول اعظم بابا لولی حاجیؒ کا اصل مسکن جگہ موضع آرون تھا (۲)۔

گو اس بات پر اتفاق ہے کہ اقبال کا اصل وطن کشمیر ہے مگر ان کے پیرو، برہمن پنڈت ہونے پر پھر محققین الجھ جاتے ہیں مگر ان کے اشعار میں کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں کہ ان کو پنڈت (سپرو) سے جوڑنا مناسب اور قرین قیاس نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں فلسفہ سرزمین برصغیر کا خاصہ رہا ہے جس کا ذکر بھی علامہ کی شاعری میں اکثر ملتا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائی روم و تبریز است

میں اصل خاص سوموناتی آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد میرے کف خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میری آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائی دل میں (۳)

اس بحث سے پرے میرے مقالے کا مقصد علامہ اقبال کے اس فکری نہج سے ہے جس میں عشق کشمیر کی مہک ہے، جہاں علامہ کشمیری قوم پر ستم وستمگاری کا عالم دیکھ کر درد دل اور اپنے الم کو لفظوں میں پیرو کران کی حمایت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بعد ازاں اس وادی جمیل کے فطری حسن کی عکاسی کرتے ہیں۔ دیوانہ وار آبشار وگل ونرگس سے محو گفتگو ہوتے ہیں اس برہمن زادۂ کو کشمیر

سے کس قدر انس تھا وہ ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

کشمیر ابتدائی زمانہ سے ہی کشت وخون کا کھیل دیکھتا رہا گھروں کے گھر ویران علائے سناں ہوئے۔ابتداء میں جب شاہ میر سلطان شمس الدین کے زمانے میں حملہ ہوا تو ہزاروں افراد تہہ تیغ ہو گئے۔ چک حکمرانوں نے ظلم و بربریت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔مغلوں نے گرچہ تعمیری اور ادبی لحاظ سے کشمیر میں چند نمایاں کارنامے انجام دئے بہرحال وہ بھی حاکمان غیر ہی ٹھہرے۔ افغانوں کی تلوار کے سامنے پورا برصغیر بے بس ہوا اور ظلم واستبداد کا وہ عالم بپا ہوا کہ تاریخ بھی اسے رقم کرنے سے تھرائی۔سکھوں نے مسلمان کشمیر کو ظلم کی چکی میں پیس کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ڈوگرہ حکمرانوں نے روایت قائم رکھی، دراصل وطن کی محبت انسان کا فطری جذبہ ہے جب ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم کا علامہ اقبال نے اپنی چشم دوربین سے مشاہدہ کیا تو وہ بے اختیار پکار اٹھے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
کینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہ دردناک — مرد حق جب ہوتا ہے مرعوب سلطان وامیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردی ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر
آہ یہ قوم نجیب و چرب دست وتر دماغ — ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر(۴)

چونکہ وہ خیابان جنت کشمیر کے ہی ایک گل سرسبد تھے آدمیت اور ارتقاء آدم ان کی رگ و پے میں دوڑتا خوں تھا کشمیر کی زبوں حالی اور تباہی دیکھ کر چشم نمناک ہو جایا کرتی تھی۔مورخین لکھتے ہیں کہ فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگان نے ''انجمن مسلمانان کشمیر'' کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا۔جس کا مقصد اس علم کی کم مائگی اور ثقافتی زبوں حالی کا تدارک تھا جو اس وقت کے راجہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کی وجہ سے وادی کے گوش و کنار پھیل چکی تھی۔ پریم ناتھ لکھتے ہیں کہ چالیس سال کی حکومت کے باوجود ڈوگروں نے امن وسلامتی کی طرف توجہ نہ دی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری قوم زبوں کا شکار ہوگئی (۵)۔اس انجمن میں علامہ پر جوش طریقہ سے حصہ لیتے تھے اور نظمیں پڑھتے تھے یہ انجمن ۱۸۹۷ء کے وسط میں بند ہوگئی۔۱۹۰۱ء میں اس انجمن کو دوبارہ سے قائم کیا گیا۔علامہ نے ذیل کے قطعات اس انجمن میں پڑھے ان کا ایک لفظ مظلوم قوم کی فریاد کے احساس سے نشتر دل بن جاتا ہے ملاحظہ کریں۔

کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا — ''پائے گل اندر چمن دائم پر است از خارہا''
کہکشاں میں آکے اختر مل گئے — اک لڑی میں آکے گوہر مل گئے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے (۶)

علامہ اقبال کو بیس برس کی عمر میں کشمیر کے تئیں جذبہ انس والفت بیدار ہوا جو تادم مرگ ان کے سر میں جنون بن کر سوار رہا ہے۔جب ڈوگرہ مہاراجوں نے کشمیر کو انگریز سرکار سے خریدا تو عالم کرب میں علامہ نے یہ قطعہ لکھا۔

ای باد صبا گر بہ جنیوا گذر کنی — حرفی ز ما بہ اقوام عالم باز گوئی
دہقان کشت و جوی و خیابان فروختند — قومی فروختند و چہ ارزاں فروختند (۷)

علامہ کی عمر بڑھنے کے ساتھ ہی کشمیر اور کشمیریت کے تئیں ان کا جذبہ حریت بڑھتا گیا۔علامہ نے اپنی شہرہ آفاق فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں رجال کشمیر سید علی ہمدانیؒ اور طاہر غنی کے عنوان سے جو نظمیں لکھی وہ پیغام حریت و بیداری کے سوا کچھ نہیں۔

گو کہ علامہ کا کشمیر کی سیاست سے کوئی شغف نہ تھا البتہ وہ اہل کشمیر حقوق دلانے کی تدابیر سوچتے رہے۔ منشی محمد دین فوق جو ایک بے بدل قلم کار تھے کو لکھے گئے خط میں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ علامہ کشمیری قوم کے تئیں کس قدر فکر مند تھے۔

''کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے البتہ کشمیر کی غیر پرستی ایک ایسا موضوع ہے جس پر آپ نے کچھ نہیں لکھا ہے۔(۸)''

البتہ ان کی نظم ساقی نامہ میں کشمیری قوم کی اسی مناسبت سے چند اشعار زیر میں قلم بند کئے جاتے ہیں۔

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتی می تراشد ز سنگ مزاری
بریشم قبا خواجہ از محنت او — لفیب تنش جامہ تار تاری
ضمیرش تہی از خیال بلندی — زخود ناشناسی زخود شرساری (۹)

بہر حال علامہ کو اپنے وطن اسلاف سے محبت تھی اور اس وطن عزیز کے تئیں جذبہ و محبت رکھتے تھے۔ دوسری جانب علامہ کی شاعری سب سے حسین حصہ ان کی پیکر تراشی اور فطری عکاسی ہے۔ علامہ نے کشمیر کے باغ نشاط میں جو ساقی نامہ لکھا اس کا ہر شعر اقبال کے فطرت شناس ہونے پر دلالت کرتا ہے ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

چہ شیرین تو آئی چہ دلکش صدائی — کہ می آید از خلوت شاخساری
بہ تن جان، بہ جان آرزو زندہ گردد — ز آوائی ساری ز بانگ ہزاری
چہ خواہم درین گلستان گر نہ خواہم — شرابی، کبابی، ربابی، نگاری
کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتی می تراشد ز سنگ عزاری
ضمیرش تہی از خیال بلندی — خودی نا شناسی زخود سرشاری (۱۰)

ساقی نامہ کے علاوہ کشمیر اور غنی پر بھی دو نظمیں علامہ کے کلیات میں ملتی ہیں۔ فطرت اور فطری عکاسی کا وہ نقشہ جو علامہ نے کشمیر کے متعلق الفاظ میں پرویا ہے ان کی نظم میں ملاحظہ کیجئے۔

رخت بہ کاشمر کشا، کوہ و گل دمن نگر — سبزہ جہان جہان ببین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار موج موج — صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
شانہ فتد زینغش چشم سپہر فتنہ باز — بستہ بچہرۂ زمین برقعہ نسترن نگر (۱۱)

''جاوید نامہ'' علامہ اقبال کی شہرہ آفاق تصنیف ہے مذکورہ تصنیف میں علامہ نے سخن بہ نژاد قوم میں انقلاب اور بند غلامی توڑنے کی باتیں کہیں ہیں۔ علامہ نے شاہ ہمدان سے جو ضمنی گفتگو اشعار میں کی ہے وہ بھی دراصل کشمیر سے محبت سے سرشار ہے۔ ذیل کے اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔

سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آن کشور مینو نظیر — میر و درویش و سلاطین را مشیر
آفرید آن مرد، ایران صغیر — با ہنرہای غریب و دل پذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ — خیز و تیرش را بدل گرہی بدہ (۱۲)

علاوہ ازیں علامہ نے منظر نگاری اور معموری جوان بانگ درا والی نظموں میں ملتی ہے بھی عکس کشمیر جھلکتا ہے۔ خزان کی

فطرت کی رنگینیاں، دریاؤں، مچھلیوں اور ندیوں میں جو روانیاں ہیں سب کی عکاسی علامہ کے اشعار میں بہت مرعوب طرز میں گئی ہے۔ بانگ درا کے ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ارم بن گیا دامن کوہسار
گل ونرگس و سوسن و نسترن شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں (۱۳)

علامہ اقبال کی فارسی اور اردو شاعری میں فطرت کی عکاسی کے علاوہ کشمیر کی خوبصورتی کا منظر پیش کیا ہے علامہ کے اشعار درد و کرب اور انقلاب کے پہلوں نمایاں ہیں علاوہ ازیں کشمیریت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

منابع وحواشی۔

(۱) پیام مشرق ص ۲۱۴
(۲) روح مکاتیب اقبال۔ عبداللہ قریشی۔ ص ۳۵۱
(۳) ضرب کلیم۔ ص ۱۰
(۴) ارمغان حجاز۔ ص ۲۲
(۵) History for freedom struglle in kashmir- P.N. Bazaz- P17
(۶) کشمیر گزٹ، لاہور، مطبوعہ دمسبر ۱۹۰۱ء
(۷) جاوید نامہ، جلد دوم، ص ۲۷۱
(۸) روح مکاتیب اقبال از عبداللہ قریشی۔ ص ۵۷۔۱۷۴۔ مطبوعہ ۱۹۷۷ء
(۹) پیام مشرق۔ ص ۱۳۳
(۱۰) ایضاً۔ ص ۳۴۔۱۳۳
(۱۱) ایضاً ص ۱۵۵
(۱۲) جاوید نامہ جلد دوم۔ ص ۲۷۴
(۱۳) بانگ درا۔ ص ۱۷۳

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

علامہ شبلی نعمانی کی فارسی غزل سرائی

علامہ شبلی نعمانی ہمارے ملک وقوم کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جن کا نصاب فکر جب اپنے عہد کے اسالیب حیات اور روح عصر کی توانائی سے پھوٹ کر منظر عام پر آیا تو نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آئندہ ادوار کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوا اس ذات گرامی کی بے پناہ علمیت اور معنویت ہر عہد و ہر زمانے کی فکر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی اور اپنی رنگارنگی، شگفتگی اور جدت سے ہر دور کے اذہان کو جلا بخشتی رہی علامہ مرحوم مؤرخ بھی تھے، ادیب بھی، سوانح نگار بھی، سیرت نگار بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی، عالم بھی ہیں اور متکلم بھی، شاعر بھی اور نثر نگار بھی، ان کی ہر حیثیت ان کی دوسری حیثیت سے بڑھ کر تازہ، توانا، حیرت انگیز اور بے نظیر ہے، وہ ماضی کے ترجمان بھی ہیں اور مستقبل کے علم بردار بھی غرض علامہ شبلی نعمانی ایک متنوع، رنگارنگ اور بوقلموں شخصیت کا نام ہے اور جب کسی شخصیت میں بوقلمونی ہوتی ہے تو اس شخصیت کے کسی ایک رنگ کا درست مقام و مرتبہ متعین کرنا بڑا ہی مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے علامہ شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے گو سیرۃ نبوی، الفاروق، الغزالی، الکلام، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، شعر العجم کے مصنف کے لیے شعر و شاعری کوئی خاص نشان فخر قرار نہیں دی گئی اور ان کی شاعرانہ عظمت و کمال کو بہت ہی کم زیر بحث لایا گیا جبکہ علامہ مرحوم کی زبان سے جو ترانہ ہائے موزوں ادا ہوئے ہیں ان سے صرف نظر کر پانا ممکن نہیں ہے بحیثیت فارسی شاعر ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ان کلمات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''شاعر تھے اور ہم عامیوں کی نظر میں فارسی کے بہت اچھے شاعر غزل کہتے تو بس نظیری سے ٹکر لیتے اور کسی صائب کے رنگ کی بہار دکھاتے اور شوخ و معاملہ بندی میں داغ کے ہم پلہ تھے لیکن اس بات میں بدقسمت ہیں کہ اپنے ہم وطن غالب ہی کے سے نکلے عجم میں قدر و پرسش سے محروم جس طرح غالب رہے، یہ بھی رہے''۱

علامہ شبلی نے شعر کہنے کی ابتدا فارسی شعر گوئی سے ہی کی تھی، فارسی شعر گوئی کا یہ ذوق انہیں اپنے استاد محترم مولانا فاروق چریا کوٹی کے فیض صحبت سے حاصل ہوا تھا گو کہ ان کے عہد میں اردو زبان ابھی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن و دل مسحور کیے ہوئے تھی بایں ہمہ انہوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کی مصوری و ترجمانی کے لیے اردو زبان کے بجائے فارسی زبان ہی کو درخور اعتنا تصور کیا اور اپنے ترانہ ہائے دروں کو قلم و قرطاس کے سپرد کر کے جریدۂ عالم پر بحیثیت فارسی شاعر کے بھی نقش دوام ثبت کیا ان کو فارسی زبان پر بھی حاکمانہ قدرت حاصل تھی ان کی فارسی شاعری کی بے پناہ اہمیت و افادیت کے متعلق مرزا احسان احمد صاحب کہتے ہیں کہ:

''علامہ مرحوم شاعرانہ رنگینی، لطافت اور نازک خیالی کا اصلی تماشا گاہ ان کی فارسی شاعری ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اہل زبان اساتذہ کے مقابلے میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے''۲

علامہ ایک عہد ساز شخصیت کے حامل تھے کا تب ازل نے اس پیکر خاکی میں متعدد صفات حمیدہ اور مختلف النوع کمالات

کو ودیعت کیا تھا اور انہیں بلند تر کاموں کے لیے اس روئے زمین پر بھیجا گیا تھا لیکن چوں کہ دل حساس کے مالک تھے اس لیے طبیعت میں شاعرانہ رنگینی اور لطافت بدرجۂ اتم موجود تھی جو وقتاً فوقتاً موزوں کلمات کے پیرایہ میں ظاہر ہوتی رہتی تھی علامہ شبلی کے فارسی کلام کا سب سے بڑا کمال اس کی سادگی، عام فہمی اور اثر آفرینی ہے جس کے سبب ان کا ہر شعر ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق بن جاتا ہے ان کی زبان نہایت سہل، سادہ اور رواں ہے، جس کے سبب عام استعداد کے انسان کے لیے بھی اس کا سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا کوئی مشکل نہیں خواجہ عبدالرشید نے کلام شبلی کو مرزا غالب کے کلام پر فوقیت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''.....غالب کے بعد اردو شعر کے کہنے والے دو تین فارسی گو شاعر ایسے پیدا ہوئے جن کا فارسی کلام ہر لحاظ سے غالب پر سبقت لے جاتا ہے، مثلاً شبلی گرامی اور اقبال ان کی زبان غالب کے فارسی کلام سے زیادہ ستھری، نکھری ہوئی اور بامحاورہ ہے''[۳]

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی فارسی دانی کے متعلق غالب کی طرح بڑے بڑے دعوے کبھی نہیں کیے اور نہ ہی خود کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنے کا خیال ان کے دل میں آیا وہ شاعری کو محض لفظی بازی گری نہیں سمجھتے تھے ان کا ماننا تھا کہ ایسی شاعری جو قلب و روح کو متاثر نہ کر سکے وہ بانگ خر سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

شعر اگر دامن دل می نکشد بانگ خر است نغمہ گر نیست دل آشوب بہ غوغا ماند

علامہ شبلی نعمانی کی زبان و بیان کا صحیح اندازہ لگانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی ہر صنف شاعری پر غور نہ کر لیا جائے ان کے کلیات میں قصائد، غزلیات، مراثی، نظمیں، قطعات اور مثنویاں وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ موقع نہیں کہ ان کی تمام فارسی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی جا سکے لہٰذا اس مضمون مختصر میں ان کی غزلیات کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کے زور کلام، سلاست اور فصاحت کا اندازہ کرنے کی سعی ناتمام کی جا رہی ہے یوں تو مولانا کا پورا فارسی کلیات مختلف رنگ و بو کے گلہائے معطر سے آراستہ و پیراستہ ایک بیش قیمت گلدستہ ہے لیکن ان کی شاعری کا اصل رنگ اور ان کی شاعرانہ عظمت ان کی غزلوں میں زیادہ آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو کر اذہان پر گہرے نقوش مرتب کرتی ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں فارسی غزل کو نہ صرف آبرومند اور باوقار بنایا بلکہ اسے ایرانی شاعری کی سرحدوں سے روشناس کرا دیا''[۴]

علامہ شبلی نعمانی ان کی فارسی غزلیات کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق رقمطراز ہیں کہ:

''وہ اثر آفریں اسلوب کے سحر ساز صاحب طرز ادیب ہیں جس میں نثر و شعر کے کمال امتزاج کی دل کشی، دامن احساس کو دردل کی کشادگی بخشتی ہے، حافظ کے بعد سرمستی و سرشاری دیکھنی ہو تو شبلی کی فارسی غزلوں سے رجوع کیجئے''[۵]

ان کی فارسی غزلوں میں جو رندی و سرمستی، کیف و سرور، رنگینی و رعنائی، زندہ دلی و جوش، زور بلاغت، نفاست، سلاست اور شگفتگی ہر قدم پر ایران کے سب سے بڑے غزل سرا حافظ شیرازی کی یاد دلاتی ہے اور پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہوں نے تھوڑی سنجیدگی کے ساتھ فارسی شاعری پر توجہ دی ہوتی تو یقیناً مرتبہ میں حافظ و خیام کے برابر ہوتے انہیں خود بھی اس بات کا احساس ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایرانی استاد سے ہم عصری کا دعویٰ تو نہیں کرتے لیکن حافظ کی تقلید و پیروی کے ضرور قائل ہیں لہٰذا کہتے ہیں کہ:

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن بندگی حافظ شیرازی یا بست کرد

علامہ شبلی نعمانی ایک عالم دین تھے لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ مولوی ہوتے ہوئے بھی خوش مزاج، حسن پرست اور عاشق فطرت انسان تھے یہ بات باعث استعجاب و تحسین ہے کہ دن کے اکثر حصے میں حدیث و فقہ کے پیچیدہ و گنجلک مسائل میں

الجھا رہنے والا ہمارا یہ عالم تنہائی کے لمحات میں فرشتوں سے سرگوشی کرنے کے بجائے دل باختن، دل گرفتن کی باتیں بھی کرتا ہے یہ بات بعید از امکان معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہی ہے اور شاید یہ ہی ان کی سب سے بڑی انفرادیت بھی کہ انہوں نے اپنی شاعری کے تار و پود عشق و محبت اور اس کی سحر انگیز و سرور آمیز لذتیت سے تیار کیے ہیں ان کی غزلوں میں بت ہزار شیوہ کے جاں ستاں اور حیات بخش جلوے اور اس کی دلفریب و دل کش ادائیں عام نظر آتی ہیں ان کی تقریباً تمام غزلیں حسن و عشق کی داستان معلوم ہوتی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک وارفتہ مزاج شوریدہ سر عاشق عالم بیخودی میں محبت والفت کے نغمے گنگنا تا چلا جا رہا ہے:

من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم میل بالا بہ رخاں گر نکنم تا چہ کنم

اور اس عاشق زار کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ سننے والوں کے ذہن و دل پر اس کی کیا شبیہ بن رہی ہے یہ ہی وجہ ہے علامہ کی ہمہ فارسی شاعری بڑی حد تک فطری اور بعید از تصنع معلوم ہوتی ہے، ان کے یہاں سچے اور صحت مند عشق کی چمک و دمک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو کر قاری کو ایک سرور آمیز لذت سے ہمکنار کرتی ہے:

''اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو غزلیات سے ایک مکمل حیات معاشقہ کے مختلف منازل کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اشعار کیا ہیں ابتدائے عشق سے لے کر وصال تک کے تمام واقعات اور بزم وصال کے راز و نیاز کی زندہ تصویریں ہیں''[۲]

شبلی نعمانی فطرتاً نہایت شگفتہ مزاج، رنگین طبع، حسن شناس اور عاشق مزاج انسان تھے اور اپنے پہلو میں ایک زندہ، حساس اور بیدار دل رکھتے تھے وہ صرف ظاہری حسن و زیبائی کے دلدادہ اور شیدائی نہ تھے بلکہ ایک نکتہ داں عاشق تھے اسی لیے انہوں نے حسن و عشق کے تمام رازہائے سربستہ کا برملا اظہار کیا ہے جن پر ایک ظاہر دار ہوس پرست عاشق کی نگاہ ہرگز بھی نہیں پڑ سکتی ہے وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، داستان عشق صرف ایک افسانہ یا عاشق کی سرگذشت نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پی تواں برد کہ ایں زمزمہ بی چیزی نیست شبلی ایں تازہ نوا ہا نہ مستاں زدہ ام

ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

شبلی سخن اگر چہ زراہ فسانہ بود سختی زراہ نیز بیاں کردہ ایم ما

شاعر اپنے دل کی حالت اور محبت میں اپنی بے چینی اور اضطراب کا ذکر اتنے سادہ الفاظ میں کرتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں وہ بہ مقتضائے عشق اپنے معشوق کی تعریف و ستائش کے آرزو مند ہیں لیکن افشائے راز کے خوف سے صاف صاف اس کا نام نہیں لیا جا سکتا لہٰذا مبہم طریقہ بیان اختیار کرتے ہوئے اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے کا بھی یہ انداز کتنا انوکھا، دلچسپ اور پیارا ہے کہ پڑھنے والا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

زبس کز و بیم افشا وصف او در پردہ می گویم حدیثم از گل و نسریں و شمشاد است پنداری

وہ ایک بے چین و مضطرب عاشق دنیادار کی طرح اپنے دل میں اٹھنے والے طوفان جذبات کی ہو بہو عکاسی ضروری سمجھتے ہیں عشق و محبت میں بے اختیار و مدہوش عاشق بے ساختہ اپنے احساسات درون کو معشوق کے سامنے پیش کرتا ہے حالاں کہ عاشق خود اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اظہار محبت غیر ضروری اور خلاف مصلحت ہے، کیوں کہ معشوق کو عاشق کی حالت زار کا بخوبی احساس ہوتا ہے لیکن دل پر قابو نہیں ہوتا لہٰذا بے ساختہ عشق کی ترجمانی زبان سے ہونے لگتی ہے۔

شوق نگذاشت کہ دستی نہم بر دل خویش ورنہ ایں سوز ہنوز از تو نہاں می بایست

لیکن یہ داستان عشق وہ داستان ہے جو سو بار دہرانے پر بھی مکرر نہیں ہوتی بلکہ ہر بار اس کو بیان کرنے میں ذوق کے کام و

دہن کو ایک نئی لذت وسرور کا فرحت بخش احساس ہوتا ہے جب کوئی خوش ورنگین نوا مطرب اس ساز عشق کے پردوں کو چھیڑ دیتا ہے تو ہر بار قلب وروح کو ایک نیا سرور آگیں احساس ہوتا ہے۔

ذوق حدیث عشق تواں دید کہ ایں سخن صد بار گفتہ ایم ومکرر نہ گشتہ است

محبت اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کے دل ودماغ کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتی ہے اور عاشق زمین پر رہتے ہوئے بھی خلاؤں کا مسافر ہو جاتا ہے۔

محبت بہ بالا برد دل مارا زمینی را بود وآسماں کرد

علامہ شبلی نعمانی کی دور بین اور دقیق بین نگاہ میں تو محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ عاشق ہر حال میں راضی بہ رضا رہے اگر محبوب کی تیغ جفا سو بار بھی اٹھے تو ایک مخلص، وفا پرست اور سچے عاشق کی شان عقیدت یہ ہی ہے کہ وہ کبھی اپنے سر نیاز کو جھکانے میں ذرہ برابر بھی تامل نہ کرے لہٰذا کہتے ہیں کہ:

من آنم کہ از تیغ جفا بردارم گرچہ صد مرتبہ چوں شمع مرا سر زدۂ

علامہ شبلی کی وہ فارسی غزلیات جو بمبئی کی سحر انگیز فضا میں کہی گئی ہیں، خاص طور سے مورد بحث اور معرض اختلاف رہی ہیں کچھ لوگوں کے نزدیک وہ اسرار معرفت کے درجے تک پہنچ گئیں تو کچھ دانشوران ادب کے نزدیک تعریض وتنقید کا سبب بن گئیں لیکن اس تنقیص وایراد سے قطع نظر علامہ شبلی نعمانی نے خود اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

شبلیا نا بلد کوچۂ عشقیم ولی دوستاں ہمت ایں شیوہ ما نیز کنند

علامہ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حق وصداقت کے اعلان کو اپنا فرض اولین قرار دیا، خواہ علم ومذہب سے متعلق مباحث ہوں، تحقیق وتنقید کے دقیق مسائل یا پھر حسینان بمبئی کے توبہ شکن نظارے وہ کبھی اپنے احساسات صادقانہ کو پوشیدہ رکھ کر منافقت کا گناہ گوارا نہیں کرتے جب وہ بمبئی کی خوبصورت فضاؤں میں ہوتے ہیں جہاں کا گوشہ گوشہ حسن آباد اور جذبات میں ہیجان برپا کرنے والا ہے، تو بجائے مولانا شبلی کے صرف شبلی رہ جاتے ہیں:

شاعری از من مجدور از سواد بمبئی حالیا شبلی شدم غزل خواں نیستم

مولانا شبلی کی بمبئی کی فضاؤں میں میں کہی گئی غزلوں میں ایک خاص قسم کی لطافت، نزاکت، عذوبت، موسیقیت، حلاوت اور لوچ ملتا ہے، جو اپنی نغمگی وترنم ریزی میں حافظ وسعدی کی غزلوں سے کم نہیں ہے اس کی سب سے بڑی اور خاص وجہ یہ ہے کہ بمبئی کے قیام کے دوران مولانا کا تعارف مشہور ومعروف فیضی خاندان کی بیگمات سے ہوا بالخصوص وہ عطیہ فیضی بیگم سے ایک خاص قسم کی ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی رکھتے تھے ان کے متعدد خطوط عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے ہیں اس کے علاوہ کچھ خطوط زہرا بیگم کے نام بھی ملتے ہیں ان کی والہانہ تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ علامہ کو ان بیگمات سے کافی انس تھا اور یہ ہی سبب ہے کہ ان کی وہ فارسی غزلیں جو بمبئی میں کہی گئی ہیں ان میں جمال ہم نشین کا اثر پایا جاتا ہے ان کی ایک فارسی غزل ملاحظہ فرمایئے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بمبئی کے آشوب گاہ حسن وجمال نے ان کے مزاج پر کتنے گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

نثار بمبئی ہر متاع کہنہ و نو را طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بہ ہر سوز ہجوم دلبراں شوخ بی پروا گذاشتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را
فغاں از گرمی ہنگامہ خوب زردشتی ہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت وضو را
ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب چو پای و گلگشت اپالو را

بیا شبلی بہ یاد پختہ گیرائی مژگانش دگر رہ پا رہ ساز مرا ایں قبای زہد صد تو را

علامہ شبلی نعمانی کے مولویانہ ماحول اور منصبی فرائض نے انہیں ہمیشہ اپنے عاشقانہ جذبات کے بے محابا اظہار سے روکے رکھا اور شائد یہ ہی وہ بندش تھی جس کے سبب ان کے جذبات عاشقانہ میں بے پناہ جذب وسرور اور سوز وگداز پیدا ہو گیا تھا اور جب اس سوز وگداز نے جلوہ ہائے بمبئی اور سخنہائے شیریں کی معیت اختیار کی تو اس وادی نغمۂ شباب کی پرسرور، پرکیف اور ہوش ربا فضاؤں نے اس سوز وگداز میں نقوش رنگا رنگ کے انعکاسات کو سمو دیا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

بمبئی بود مرا منزل مقصود و بحث بیش ازیں گام طلب در رہ حرماں زدہ ام

وہ اس شہر کی فضائے حسن میں سرمست و مدہوش ہو جاتے ہیں اور سرشاری و بیخودی کے عالم میں اس کی تعریف وتوصیف کا راگ الاپتے چلے جاتے ہیں:

ایں غزل فیض اثر بمبئی است پاس تا بادہ ایں میکدہ در جوش آید

ان کی فارسی کلیات میں موجود بہترین اور نادر غزلیات وہی ہیں جو انہوں نے دوران قیام بمبئی کہی ہیں ان میں جو صداقت اور واقعیت ملتی ہے وہ اہل زبان کی غزلوں سے بھی زیادہ اثر آفرینی اور سحر انگیزی رکھتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی فارسی غزلیات میں بلا کا تغزل پایا جاتا ہے انہوں نے جس ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں اپنے احساسات و جذبات کو پیش کیا وہ از اول تا آخر تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں الفاظ کی خوش آہنگی وخوش سلیقی، اسلوب کی ندرت و تازگی، احساسات کی شدت وحدت اور فکری رفعت وعظمت نے ان کی فارسی غزلوں میں جو انفرادی رنگ اور بے پناہ تغزل پیدا کر دیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے علامہ شبلی کی غزلیات میں موجود تغزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شبلی کا مزاج تغزل سے خاص مناسبت رکھتا ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نظموں میں بھی غزل کی رومانیت پیدا کر دی ہے اور غزلوں میں تغزل کو اس طرح برقرار رکھا ہے گویا وہ غزل ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ یہ اہتمام کیا ہے کہ اس کی تصوف یا اخلال کے درس سے گرانبار نہیں ہونے دیا، پورے مجموعہ کلام میں یک رنگی کے ساتھ رنگینی ہے جو ان کا طغرائے امتیاز ہے''[۷]

حسن پرستی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عاشق مزاجی، رندمشربی، غم آشنائی اور جنوں سامانی تغزل آفرینی میں سب سے زیادہ معاون ومددگار ثابت ہوتی ہے چوں کہ عشق ایسی عمومی اور آفاقی خواہشات کا منبع ومحور ہوتا ہے جن میں بیشتر کی تکمیل سماجی اور اخلاقی بندشوں کے باعث ممکن نہیں ہوتی جب ہم ان آرزوؤں، تمناؤں اور ان کے فطری متعلقات کا ذکر ارتفاعی شکل میں شعر کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو ہمارے دل سے بے اختیار آہ یا واہ نکل جاتی ہے، چند شعر ملاحظہ کیجئے:

حدیث دل کش و افسانہ از افسانہ خیزد دگر از سر گرفتم قصہ زلف پریشاں را
دل متاعیست گرانمایہ بکس نتواں داد رائگاں گر برد آں ترک بہ یغماچہ کنم
ایفائی وعدہ ساز کہ ماہم وفا کنیم آں وعدہ ہا کہ با دل ناکام کردہ ایم
گر عناں نگہ شوق بدستم بودے سہل می بود کہ عشقم بہ تو پیدا نہ شود

تغزل آفرینی میں مخصوص لفظیات، ایمائی انداز اور نرم و نازک لہجے کو بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے غزل کا موضوع سیاسی مسائل ہو یا سماجی واردات، حیات وکائنات کا فلسفہ ہو یا متصوفانہ افکار یا پھر کسی عاشق مزاج انسان کی قلبی واردات خواہ کچھ بھی ہو اس کے مزاج اور مخصوص روایات کی پاسداری ضروری ہے، تبھی اشعار میں وہ اثر آفرینی اور دل کشی پیدا ہوتی ہے جو دلوں کو مسحور و

مسخر کر لیتی ہے، علامہ شبلی نعمانی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے، جس کو پڑھ کر ان کی طبیعت کے اس رنگ کا بخوبی احساس ہوتا ہے:

خواہید اگر کہ عیش و نشاط فزوں کنید — دیوانہ ایست عقل زشہرش بروں کنید
رہ و آئین تقویٰ نیز بد نیست — اگر کاری بنا شد می تواں کرد
دل از خوباں گرفتی خوب کردی — و لیکن ذوق وعرفاں را زیاد کرد
گرچہ رندی و ہوس شیوہ دانا نبود — حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم

علامہ شبلی نعمانی کے کلام میں معاملہ بندی اور وقوع گوئی کی داستانیں بھی برملا بیان کی گئیں ہیں عیش ونشاط، عشق وعاشقی اور ہوا وہوس سے متعلق ان کے یہاں جو بھی اشعار ملتے ہیں ان میں حد درجہ بے باکی، صاف گوئی اور بے خوفی ہے، جو شاید تہذیب و اخلاق کے اعتبار سے مستحسن نہ صحیح لیکن جذبۂ دروں کے شوق و ہیجان کی بہترین عکاس ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی شوخی وشرارت، لذت وواقعیت ذوق سلیم پر گراں بھی گزرتی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندویؒ مرحوم نے ان کی اس قسم کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ:

''.....اس قسم کے جذبات کا اظہار شبلی کی شاعری کا تاریک رُخ ہے صرف شبلی پر ہی منحصر نہیں بلکہ جس شاعر کے یہاں اس قسم کے عامیانہ خیالت وجذبات پائے گئے اسے مطعون کیا گیا ہے.....لکھنوی شاعری کا یہ خارجی انداز شبلی کے ہاں بھی بدنما داغ کی صورت میں نظر آتا ہے''۸

معاملہ بندی اور وقوع گوئی سے متعلق ان کے کچھ اشعار دیکھئے:

از تو با بوسہ و آغوش تسلی نشوم — شب وصل و بہ ساماں تر ازیں می باید
ناز غرور حسن نہ دادش اجازتی — ورنہ سوال بوسۂ ما را جواب داد
شب وصلی از و با آں درازی آرزو دارم — کہ یک یک برشمارم حلقہ ہای زلف پیچاں را
ما را بہ بوسہ ہای شکر ریز بر نواخت — تا کس نہ گوید اینکہ طریق کرم نداشت

وہ صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کی یہ جرأت مندی اور بے باکی عریانی کی حدود تک بھی پہنچ جاتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے غیر مستحسن اور قابل گرفت ہے:

رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم چیست — دست گستاخ آنچہ فرمودا ست من آں کردہ ام
آغوش شوق، دیدۂ گستاخ و دست شوخ — در وصل ہرچہ بود زمن بہ کار بود
من فدای بت شوخی کہ بہ ہنگام وصال — بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی ر ا
غافل بہ خواب ناز تو خفتی و بوسہ ام — کام خود از دہان و بہان تو بر گرفت

ہوسکتا ہے کہ ان کے یہ اشعار تہذیب واخلاق کے نقطہ نظر سے قابل گرفت ہوں اور ان کی ادیبانہ عظمت وحرمت کے منافی تصور کیے جاتے رہے ہوں لیکن ان اشعار میں موجود ان کا شوخ وشریر منفرد وجداگانہ اور زندہ وتابندہ انداز بیان نے ان کے لہجے کو پرکشش اور دل نشین بنا دیا ہے جن میں ذہنی تسکین کے سارے لوازمات موجود ہیں وہ بذات خود بھی اپنے احساسات دروں کو پوشیدہ رکھنے کے قائل نہیں ہیں لہٰذا کہہ اٹھتے ہیں کہ:

گرچہ از دل طمعم بود کہ شیدا نشود — لیک چوں شد نتواں گفت کہ رسوا نشود

ان کی انفرادی شان یہ ہی ہے کہ وہ دل میں اٹھ رہے جذبات کے طوفان کو راستہ دے دیتے ہیں ان کی شاعری مہذب

سنجیدگی نہیں بلکہ ایک مقدس دیوانگی ہے۔ وہ ہر جذبے اور ہر احساس کو قلم و قرطاس کے سپرد کرنا اپنا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ اس قسم کے عاشقانہ جذبات قلم بند کرتے ہیں تو صرف ایک وارفتہ مزاج عاشق ہوتے ہیں محقق، مؤرخ، ادیب اور معلم نہیں یہی سبب ہے کہ ان کے اس قسم کے اشعار سے ان کی ادبیانہ شان و عظمت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آنے پاتا وہ خود اس بات کے قائل ہیں کہ راہ عشق میں دو دل ہونا سالک کے لیے سب سے بڑا عیب ہے انسان جس کسی بھی رنگ میں ہو اس کو اس رنگ میں پختہ و کامل ہونا چاہیے اس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہیں ہونا چاہیے کفر ہو یا ایمان اگر یک رنگی نہیں ہے تو نہ صرف زندگی بلکہ یہ پوری کائنات بے کیف، بے سرور اور بے رنگ ہے۔

دو دل بودن دریں روسخت تر عیب ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمان ہم

مختصر یہ کہ علامہ شبلی نعمانی کی تمام فارسی شاعری ان کی انفرادی شاعرانہ عظمت و شان کی علم بردار ہے اور ان کی یہی انفرادیت اور جداگانہ رنگ انہیں رسمی و روایتی طرز تخیل سے الگ کر دیتا ہے ان کی غزلیات کے بیشتر اشعار سادہ، سہل اور رواں ہیں لیکن سادگی کے باوجود ان میں ایک خاص قسم کی کشش، دل آویزی اور حسن کاری پائی جاتی ہے جو صوتی اعتبار سے حسین و لطیف احساسات کا ایک نادر، انوکھا اور اثر انگیز مجموعہ ہے، جو اپنی بے ساختگی، مدعا اور مضمون کے اقتضا سے خود بخود ایک موثر کن آہنگ پیدا کر دیتا ہے علامہ کے یہاں اس قدر شدت تاثر اور فراوانی واقعیت ہے کہ قاری تھوڑی دیر کے لیے یہ فراموش کر بیٹھتا ہے کہ یہ وہی علامہ شبلی نعمانی ہیں جنہوں نے الکلام، سیرۃ النبی اور الغزالی جیسے مذہبی شاہکار لکھ کر عالم اسلام میں اپنی ایک انفرادیت قائم کی جن کے یہاں ہر روایت کو درایت پر پرکھا جاتا ہے، جن کے نزدیک عقل کا فیصلہ ہر چیز پر مقدم ہے اور جو کسی بھی بات کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ ذہن و دل اس کی صداقت کے دلائل نہ پیش کر دے لیکن جب ان کے قلم سے موزوں کلمات تراوش کر صفحات پر موتیوں کی مانند اپنا جلوہ بکھیرتے ہیں تو وہ ساری عقلیت و دانائی کو چھوڑ کر صاف صاف کہہ اٹھتے ہیں:

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوئی — سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد بر قامت من راست نبود — شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آں ماہ تمام — زدہ ام ساغر و برباد حریفاں زدہ ام

حواشی

۱۔ رسالہ ادیب شبلی نمبر، پیش لفظ عبدالماجد دریا آبادی، ۷ص، ستمبر ۱۹۶۰ء علیگڑھ
۲۔ مقالات احسان، مرزا احسان احمد، ۴۲ص، ۱۹۶۸ء معارف پریس اعظم گڑھ
۳ تذکرہ طالب آملی، خواجہ عبدالرشید، ۷۵ص، ۱۹۶۵ء فیروز سنز کراچی
۴ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت، مضمون پروفیسر عمر کمال الدین، ۲۲۰ص، ۲۰۰۸ء پرنٹ آرٹ دہلی
۵۔ ۔۔۔۔۔، مضمون پروفیسر عبدالحق، ۵۷ص، ۔۔۔۔۔۔
۶۔ رسالہ مخزن، مضمون نگار محمد شفیع، ۲۷ص، مارچ ۱۹۲۸ء لاہور
۷۔ رسالہ ادیب شبلی نمبر، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ۱۵۲ص، ستمبر ۱۹۶۰ء علیگڑھ
۸۔ رسالہ ادیب شبلی نمبر، عبدالسلام ندوی، ۱۵۰ص، ستمبر ۱۹۶۰ء علیگڑھ

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر
استاد شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

امیر خسرو کی شاعری کے چند نمایاں پہلو

ہندوستان کے سلاطین و بادشاہوں نے اپنے اپنے طور پر اور درباری اعتبار سے علم وادب وثقافت کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور یہ درباران سلاطین ان تمام سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔لیکن دربار تک رسایی عام لوگوں کے لئے آسان نہیں تھی ان کے علاوہ بھی اور بھی ایسے عوامی دربار موجود تھے جہاں ہر خطے اور ہر طبقے کے لوگوں کی رسایی باسانی کر سکتے تھے، یہ صوفیا اکرام کے آستانے اور خانقاہیں تھیں جہاں سے تمام انسان روحانیت، صبر وسکون، قناعت اور توکل کا عملی درس حاصل کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ صوفیاء اکرام نے عوام کے دل حسن اخلاق سے جیت لیا اور اس طرح سلطانوں کے درباوروں کی نسبت فقیروں اور درویشوں کے حجروں میں عوام کی تعداد ہمہ وقت موجود رہتی تھی جو ان کے لئے روحانی فیض کا ذریعہ تھیں۔گرچہ صوفیاء کا مطمع نظر ادب کی تخلیق اور ان کا فروغ بالکل نہیں تھا وہ عوام سے براہ راست خطاب کیا کرتے تھے

ہندوستان میں فارسی کے اولین شاعر اور موسیقی کے ماہر امیر خسرو کا لقب ابوالحسن اور نام یمین الدولہ تھا، عرفیت امیر خسرو ان کے والد امیر سیف الدین ایک ترک سردار تھے وہ منگولوں کے حملوں کے وقت ہندوستان آئے اور آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، کچھ عرصے بعد یہ خاندان دہلی منتقل ہوگیا، والد کے انتقال کے بعد خسرو کی پرورش کی ان کے نانا نے کی۔نانا کی سر پرستی کی وجہ سے امیر خسرو کا تعلق دربار سے استوار ہوگئے۔امیر خسرو فارسی نظم ونثر پر دستگاہ کامل رکھتے تھے عربی سنسکرت، ترکی برج بھاشا نیز دیگر زبابوں سے بھی واقفیت تھی باعمل صوفی تھے موسیقی میں خاص مہارت رکھتے تھے انہیں فن موسیقی کا امام بھی تسلیم کیا جاتا تھا اور شاعری کے اعتبار سے انہیں طوطی ہند بھی قرار دیا گیا ہے۔ان کی نظم ونثر اور تصانیف کی اصل تعداد ابھی تک معلوم نہیں، مورخ برنی اور سیر الاولیاء کے مطابق امیر خسرو کی تصانیف سے ایک کتب خانہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ان کے اشعار کی تعداد دولت شاہ کے نزدیک چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے، نظم میں خسرو کے پانچ دیوان، نو مثنویاں۔جن میں خمسہ بھی شامل ہے اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔امیر خسرو ان خوش نصیب شعراء میں سے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں ہی شہرت ومقبولیت حاصل ہوگئی اور انہوں نے اپنے دیوان کا طویل دیباچہ بھی خود ہی لکھا ہے

امیر خسرو کی ہمہ رنگ شخصیت کے پہلوؤں کا بیک وقت جائزہ لینا از حد مشکل ہے ان کی رنگارنگ شخصیت ہندوستان اور عجم کی اقدار کا مرقع نظر آتی ہے برصغیر میں ان جیسا جامع صفات اور سے زیادہ عمدہ ذوق جمال رکھنے والا کو دوسرا پیدا نہیں ہوا امیر خسرو جامع کمالات اور شخصیت کے مالک ہیں، انہوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں، فارسی شاعری کی تاریخ میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے ہر صنف میں حسن ولطافت، پختگی اور مہارت سے شعر کہے ہوں خسرو کے اشعار ہر صنف سخن میں استادوں کے ہم سایہ نظر آتے ہیں، فردوسی مثنوی، انوری قصیدہ، حافظ، سعدی، نظیری غزل، وغیرہ اپنے اپنے میدان کے ماہرین ہیں اور یہ تمام اکابرین دوسرے اصناف سخن میں اتنی پختگی نہیں لا پائے لیکن خسرو کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، ہر میدان میں طبع آزمایی کی ہے اور بہت ذمہ داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خسرو ہر صنف سخن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ان تمام کو معراج تک پہونچا

دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس زمانے سے آج تک دانشوروں اور شاعروں نے ان کو بلند مرتبہ دیا ہے، غرۃ الکمال میں خسرو نے خود ہی شاعری کا مرتبہ تہ کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ شاعروں کے معاملے میں وہ حقیقی استاد ہے جس کے کلام میں یہ چار شرائط موجود ہوں، کسی نئی طرز کا موجد ہو، کلام آسانی ہو شیرنی اور غلطیوں سے پاک ہو، انداز واعظوں اور صوفیوں جیسا ہو، دوسرے شاعروں کی نقل کر کے اپنا قصر شاعری تعمیر نہ کیا ہو۔

نظم کس از عیب و ھنر پاک نیست　　آب روان بی خس و خاشاک نیست
چشم ھنر بین بود از عیب پاک　　بی ھنر ار عیب کندزو چہ باک
عیب ھنر مند کہ جوید خسی　　آیینہ را پشت نبیند کسی
دیدہ انصاف چو بینا بود　　در شمرد گر چہ کہ بینا بود

ان تمام کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جو کچھ میں نے نصیحت کے طور پر اخلاق کے بارے میں لکھا ہے اس میں حکیم سنائی اور خاقانی کی پیروی کی ہے۔ انہوں صاف طور پر کہا ہے کہ ان چار شرائط میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ اس لیئے میں درحقیقت استاد نہیں ہوں۔ میرا کلام صوفیا اور واعظین جیسا نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ میں چوری نہیں کرتا۔ انصاف اور خود شناسی کی اس سے بہتر مثال شاید کسی نے کبھی پیش کی ہو۔

انسانی رشتے، اخلاقی قدریں اور خلوص ومحبت ان کا سب سے بڑا پیغام ہے۔ شاعری میں اس سے پہلے خاص خاص چیزوں کی تعریف وتوصیف پر اشعار نہیں کہے جاتے تھے مثلاً قلم، کاغذ، دریا، کشتی، شمع، صراحی، جام، پھلوں اور پھولوں کے بارے میں اس طرح کی مسلسل نظمیں نہیں ملیں، لیکن امیر خسرو نے شاعری کی اس کمی کو پورا کیا، مثنوی قرآن السعدین میں اکثر اسی قسم کی مثالیں ہم دیکھ سکتے ہیں ہے۔ کشتی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ساختہ از حکمت کار آگہان　　خانہ گردندہ بہ گرد جہان
گر چہ بادریا گزر دبیش وکم　　آب بدست آرد وباز افگند

آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں امیر خسرو کو بانی وقوع گویی لکھا ہے، وقوع گویی میں شاعر دوسرے نکتوں سے استفادہ حاصل کرتا ہے مثلا عام محاورات وروزمرہ کے مکالمات کا استعمال اپنی شاعری میں کرتا ہے مثلا

بتی و آفت تقوی و آخر این نمی دانی　　کہ در شہر مسلمانان نباید این چنین آمد
جراحت جگر خستگان چہ می پرسی　　زغمزہ پرس کہ این شوخی از کجا آموخت
مست آن ذوقم کہ شب درکوی خویشم دید وگفت　　کیست این گفتند مسکینی گدایی می کند

امیر خسرو کے قصائد، خاقانی، انوری اور کمال کی پیروی اور تقلید میں ہیں۔ آپ کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ جس استاد کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خاقانی کے ایک مشہور قصیدے کے جواب میں خسرو نے ایک طویل قصیدہ لکھا، اس میں وہی اسلوب، طرز تحریر وہی، تشبیہات استعارات بھی وہی اور اسی طرح کی ترکیبات بھی استعمال کی ہیں۔ آپ کے قصائد میں مدح عموماً کم پائی جاتی ہیں۔ مدحیہ قصائد بے کیف اور بے مزہ ہوتے ہیں، جس کا بظاہر سبب یہ ہے کہ وہ مدح گویی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

انہوں نے غزل میں سعدی کے سبک کی پیروی کی ہے اور خود لکھتے ہیں **کہ جلد سخنم دارد شیرازہ شیرازی**، مثنوی میں نظامی گنجوی، اخلاقی شاعری میں سنائی اور خاقانی، قصیدے میں عرفی، نظیری کو نمونہ بنایا ہے۔ خسرو نے غزل گوئی میں سعدی کی پیروی بھی

کی۔اس وجہ سے آپ کو طوطی ہند کا لقب ملا۔امیر خسرو صرف مقلد نہیں تھے۔انہوں نے غزل میں بعض نئی باتیں بھی پیدا کی ہیں۔

سعدی نے غزل کے مزاج کے مطابق اسے زبان دی اور اس کے حلقہ کو اور وسیع کیا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں غزل کا امام کہا جاتا ہے۔لیکن ان کے غزلیات میں احساسات و جذبات کی گرمی کم معلوم دیتی ہے اور سوز و گداز کی تڑپ کم ہے۔وہیں امیر خسرو کی غزلیات میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کی غزلیات میں سوز و گداز، جذبات و احساسات، عشق و محبت، محبوب کی بے نیازی، عاشق کی خاکساری، فراق کی اذیتیں، جذبات کی گرمی، احساسات کی شورش، جوش و حرارت بکثرت نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای نرخ بالا کن کہ ارزانی ھنوز

جان زتن بردی و در جانی ہنوز درد ہا دادی و در مانی ہنوز

امیر خسرو کی تشبیہات عام طور پر تازہ ہوتی ہیں۔ان کی کوئی غزل اس طرح کی نہیں دکھتی جن میں اس طرح کی چیزیں نہ دکھتی ہوں۔تشبیہوں کے انتخاب ہندی ماحول سے بھی آپ کو مدد ملتی ہے۔فارسی شاعری میں عموماً رفتار محبوب کو مور کے خرام سے تشبیہہ دی جاتی ہے لیکن خسرو کو کبوتر کی مستانہ چال میں بھی وہی کیف و مستی نظر آتی ہے۔

خرام آن صنم ناز نین بعیاری کبوتری بخرام آمدہ است پنداری

غلام نرگس ہستم با مراد دلگاہ قدم بدست گرفتہ ز خواب بر خیز د

امیر خسرو موسیقی کے ماہر تھے۔اس لیئے جہاں ان کی توجہ کلام پر تھی وہاں حسن صورت پر بھی تھی، چنانچہ انہوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ شعر میں زیادہ سے زیادہ ترنم و نغمہ پیدا کیا جائے۔ایسے مناسب اور ہم آہنگ الفاظ لاتے ہیں کہ شاعری موسیقی کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔مثال کے طور پر۔

از پی جانان جان ہم رفت، جان ہم رفت جان ہم رفت این ہم رفت، آن ہم رفت

انہوں نے اشعاروں کو چھوٹی بحر میں لکھیں ہیں جن میں ایک طرح کی ترنم اور روانی ہے۔آپ کلاسیکی موسیقی کے بھی استاد تھے۔کوشش کرتے تھے کہ محبت بھرے اشعار کو اختصار اور سادگی سے ادا کریں۔

مضمون آفرینی جو سبک ہندی کی خصوصیت ہے۔کمال اسمعیل کی ایجاد ہے لیکن ان کی مضمون آفرینی قصائد تک محدود ہے۔طوطی ھند نے کمال الدین اسماعیل کا اثر لیتے ہوئے پیروی بھی کی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ کمال اماعیل نے نے قصیدہ میں اس کا استعمال کیا ہے اور خسرو نے غزل میں اور اس صنف سخن میں مضمون آفرینی یا مضمون سازی کا موجد امیر خسرو ہیں۔مضمون آفرینی کی چند مثالیں ذیل میں ہے۔

زہی عمر دراز عاشقان گر شب ہجران حساب عمر گیرند

امیر خسرو نے اپنے کلام کے ذریعے تصوف کا ہمہ گیر اور آفاقی پیغام دیا ہے۔یہ ان تعلقات کا نتیجہ ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کے مابین پیری اور مریدی کی صورت میں قائم تھے۔حضرت نظام الدین اولیاء چاہتے تھے کہ لوگوں کے دلوں کو مخاطب کر کے انہیں سیدھے سادھے تصوف سے آشنا کریں۔جس میں کسی قسم کی گہرائی اور پیچیدہ گی نہ ہو۔مگر مشکل یہ تھی کہ ان کا حلقہ اثر کچھ محدود تھا۔انہیں خانقاہ سے نکلنے کے کم مواقع میسر آتے تھے۔چنانچہ اس کام کے لیئے انہیں ایسی شخصیت کی ضروری تھی جو معاشرے کے مختلف طبقوں تک ان کا پیغام پہنچا سکے۔

حسن اتفاق سے امیر خسرو ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے ۔انہوں نے اپنے مرشد کی زبان بن کر صوفیانہ عقائد کی تبلیغ بالکل اس طرح کی جیسے کہ وہ خود چاہتے تھے ۔امیر خسرو لوگوں کو تصوف کی سادہ تعلیم سے روشناس کرانا چاہتے تھے ۔اس لیئے انہوں نے پیچیدہ اور مشکل اصلاحات سے گریز کیا اور تصوف کی تعلیم کو سادہ اور عام فہم بنا دیا۔

امیر خسرو کی بعض غزلیں مسلسل ہیں۔کسی ایک کیفیت میں اتنی شدت اور لہجہ گیری ہوتی ہے کہ اس کے اثر میں پوری غزل لکھ جاتے ہیں۔آپ کے اسلوب بیان پر ہندی ماحول کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے ۔انہوں نے ہندی الفاظ کو اتنی موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ وہ فارسی زبان کا جز و معلوم ہوتے ہیں ۔

دوزند قبا بہر قدت از گل سوری تاخلعت زیبای تو از لتہ نباشد

بطور مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر وفکر میں آپ کو اتنا بلند مقام حاصل ہے کہ اکثر شعراء نے آپ کی عظمت کا اقرار کیا ہے ۔فارسی شاعری میں جو مقام امیر خسرو کو حاصل ہے وہ تا حال کسی کو حاصل نہ ہو سکا یہی چیز یہ سمجھنے کو کافی ہے کہ خسرو کے پایہ کا کوی شاعر نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ثانی ہوا،ان استادی کو مانتے ہوئے بعد کے شعراء وشار نے ان کی خوب تقلید کی ہے۔حافظ شیرازی آپ کے بہت معتقد ہیں، نیز حافظ نے غیاث الدین حاکم بنگال کو جو غزل بھیجی تھی ،اس کے ایک شعر میں امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس طرح بعد کے شعرانے خسرو کی صنف سے فائدہ اٹھایا نیز ان کے سبک اور اسلوب کی پیروی بھی خوب کی اور صوفیا کی تحریک کے اخلاقی پیغام کو عوام تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا۔

ڈاکٹر تنویر حسن
لکچرر، شعبہ فارسی
گورنمنٹ ڈگری کالج
تھانا منڈی، راجوری، کشمیر

آخری مغلیہ عہد میں فارسی علم وادب: اجمالی جائزہ

چکیدہ: عہد مغلیہ فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کا سنہرا دور رہا ہے۔اس دور میں ہندوستان نے فارسی زبان کے ایسے ایسے نامور شعرا وادبا پیدا کیے جن کا جواب ایران میں بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔مغلیہ بادشاہوں، حکمرانوں اور امیروں نے اپنے عہد کی فضا کو سنوارنے، اہل شعر وسخن کے ذوق کی رہنمائی کرنے اور پروان چڑھانے میں جو خدمات انجام دیں اور جس قدر انہاک اور التفات کا ثبوت دیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اس دور میں بے شمار شعرا، ادبا، علما وفضلا آسمان ادب پر جگمگائے لیکن آخری مغلیہ دور میں جن شعرا کو دوام حاصل ہوا ان میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان داؤد، علی قلی خان، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضٰی خان فراق، میر شمس الدّین فقیر، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدّین خان آرزو، فائز، شہرت، صابر، مخلص، ریختہ گوئیوں میں نواب عمدۃ الملک، نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر، خان عالی خان، جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر ضاحک، میاں عبدالحئ تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جان جانان اور ہندی شعراء میں اعظم خان اور دیوکوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کلیدی الفاظ: مغلیہ، ہندوستان، علم وادب، شعرا وادبا.....

سرزمین ہند صدیوں تک فارسی زبان وادب کا گہوارہ رہی ہے اس سرزمین نے تہذیبی، علمی اور ادبی سطح پر ایسے لافانی اثرات چھوڑے ہیں جو ہند وایران تہذیب وفرہنگ کا مشترکہ اور بیش بہا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہندوستان میں فارسی زبان اور علوم کی روایت اور اس کا اولین نقش حکمران غزنوی کی علم دوستی اور ادب نوازی کا ثمرہ ہے بہ الفاظ دیگر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں فاتحین کی آمد کے بعد گویا تمدن اسلامی اور فارسی زبان وادب میں علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

درحقیقت اس خارجی زبان نے ہندستان جیسے وسیع ملک میں بڑی سرعت سے شیرینی، لطافت وتروتازگی، دلکشی اور ہمہ گیر صفات کی بنا پر ایک تہذیبی، ادبی اور علمی درجہ حاصل کرلیا اور ہندستانی ثقافت وفرہنگ کے مخزن میں اس قدر تیزی، سرعت و گہرائی کے ساتھ جان گزیں ہوگئی گویا کہ یہ خارجی زبان یہاں کی داخلی زبان بن گئی۔اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس خارجی زبان کی مقبولیت اور تہذیبی سربلندی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس زبان نے اپنا رشتہ عوام اور عوامی زندگی سے جوڑ لیا۔ فارسی زبان نے ہندستان کے ہر شعبہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے اور یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے ہندستان میں غزنویوں کی آمد سے لے کر مغلیہ دور کے اختتام تک یعنی آٹھ سو سال تک اس زبان نے مختلف جہتوں سے ہماری علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کی ثروتمندی میں حیرت انگیز طریقہ سے اضافہ کیا۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسلم حکمرانوں کے دور اقتدار میں جہاں ایک طرف علوم وادبیات کو نمایاں ترقی اور سربلندی حاصل ہوئی تو دوسری جانب سیاسی نیز ثقافتی سطح پر بھی اس کے اثرات غیر محدود اور ہمہ گیر رہے ہیں۔ ہزاروں ارباب علم ودانش، شعراء، ادباء، صوفیاء کے ساتھ ساتھ ہزاروں

فنکاروں نے اپنی تخلیقی اور فکری صلاحیت بروکار لانے کے لیے فارسی زبان کو ہی اظہار کا وسیلہ قرار دیا اور علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی ان شاندار روایات کو یہ دلآویزی فارسی ہی کی بدولت حاصل ہوئی اور اس زبان نے اپنی دائمی حیثیت کے نشانات ہندوستان کے فکر وفن پر ثبت کر دئے۔

فارسی زبان وادب کی ترقی اور نشونما کے لحاظ سے مغل دور ہندوستان کا درخشاں وتابناک ترین دور ہے۔ بہ الفاظ دیگر عہد مغلیہ میں اس مخصوص زبان نے جو عروج و بلندی حاصل کی وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ ایک طرف مغل بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کی فیاضی، علم دوستی، سخن سنجی اور معارف پروری اور دوسری طرف ایران کے صفوی حکمرانوں کی حوصلہ شکن روش نے ہزاروں اہل علم کو ہندوستان آنے پر مجبور کر دیا اور انعامات، اکرامات اور نوازشات کی خواہش نے ان کے حوصلے بلند کیے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرزمین ہند کا چمن اہل علم وفن کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہا تھا۔ مغل دور نے ایک فرہنگی اور تہذیبی ادارے کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ آبجو جس کا چشمہ سرزمین ایران سے پھوٹا تھا، اس نے سرزمین ہند کو بھی سرسبز وشاداب کر دیا۔

مغلیہ دور میں ہندوستان نے فارسی زبان کے ایسے ایسے نامور شعرا وادبا پیدا کیے جن کا جواب ایران میں بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ مغلیہ بادشاہوں، حکمرانوں اور امیروں نے اپنے عہد کی فضا کو سنوارنے، اہل شعر وسخن کے ذوق کی رہنمائی کرنے اور پروان چڑھانے میں جو خدمات انجام دیں اور جس قدر انہماک اور التفات کا ثبوت دیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان وادبیات کا یہ دور ظہیر الدّین محمد بابر کی آمد سے شروع ہو کر میرزا غالب پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ کم وبیش ساڑھے تین سو برس کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ مغلیہ دور فارسی زبان وادب کی تاریخ میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سرمایہ فارسی زبان وادب میں تنہا ایرانیوں کی عرق ریزی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کی عظمت بڑھانے اور اس کی قدر ومنزلت بلند کرنے میں مغلیہ بادشاہ وامراء ارباب علم وہنر کی نہ صرف قدردانی کرتے بلکہ انھیں نوازشات و اکرامات سے بھی نوازا کرتے تھے۔

جیسا کہ ماقبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ عہد مغلیہ فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کا سنہرا دور رہا ہے۔ اس دور میں بے شمار شعرا، ادبا، علما وفضلا آسمان ادب پر جگمگائے لیکن آخری مغلیہ دور میں جن شعرا کو دوام حاصل ہوا ان میں مرزا روشن ضمیر، مرزا فقیر اللہ، سیف خان، ہمت خان، بیدل، امید، فقیر اور مرزا مبارک اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

ہر دور کے کچھ مروجہ علوم ہوتے ہیں جنھیں علوم حاضرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کی شان وشوکت کا زمانہ شباب پر تھا تو اہل علم وقلم کے سامنے علوم معقول ومنقول کی تکمیل کرنا ہی علم وفضل کا آخری درجہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ، ہیت، اقلیدس اور طب وغیرہ کی دید ودانش لازمی قرار پاتی تھی وہیں سخن فہمی اور سخن سنجی بھی شرفاء کے محبوب مشاغل تھے۔ چونکہ اس وقت دہلی کی مقامی زبان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ دربار کے آداب وگفتگو کے بوجھ کی متحمل ہو سکے، فارسی زبان چونکہ حکمران وقت کی زبان تھی۔ لہذا اہل علم وقلم کے سامنے دربار تک رسوخ ورسائی حاصل کرنے کے لیے اس زبان سے واقفیت کا ہونا لازمی جزو تھا۔

رفتہ رفتہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا زوال اورنگ زیب کے عہد میں شروع ہوا کیونکہ اس کا طویل عرصے تک دکن میں قیام، مرہٹوں سے اس کی آویزش اور اس کے عقائد نے فنون لطیفہ کو درباری سرپرستی سے محروم رکھا جس کی وجہ سے اس کے دور حکومت میں فارسی شعر وادب، موسیقی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کا جو پودا ابتدائی مغلیہ دور خاص کر عہد اکبری میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا لیکن آہستہ آہستہ حکمران وقت کی سیاسی کمزوریوں وناا ہل سرپرستی کی وجہ سے پژمردہ ہو رہا تھا۔ اورنگ

زیب شاعری میں صرف ایسے اشعار پسند کرتا تھا جن میں معارف وحکم کے مضامین باندھے گئے ہوں یا ان میں کوئی اچھا اخلاقی نکتہ ہو۔

یہی وہ زمانہ تھا جب رفتہ رفتہ فارسی زبان زوال پذیر ہوتی جارہی تھی۔اس وقت فارسی کے درباری اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے اس کی حیثیت عوامی زبان کی ہوگی تھی۔ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور فارسی کا زوال شروع ہوا، تو اس دور کے فارسی شعروادب کو ''دورِ زوال'' کا شعروادب کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی تہذیب کی ترجمانی کرتا ہے جو ٹھنڈی ہوکر منجمد ہورہی تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کی شکست وریخت شروع ہوگی تھی۔مغل بادشاہ زوال کے طوفان میں گھر گئے تھے۔انھیں مصائب وآلام سے نظریں چرانے کے واسطے نظیری اور عرفی کی نہیں، گویوں اور رقاصوں کی ضرورت تھی۔ ''شیخ علی حزیں'' جیسا عظیم المرتب شاعر ہندوستان آیا اور مغل دربار اس کی قدر ومنزلت سے قاصر رہا۔ ''خان آرزو'' جیسا عظیم شاعر اور عالم جسے ''امام المعاخرین'' کہا جاتا ہے مغل دربار اس سے اسے کوئی فیض نہ حاصل ہوسکا۔اب اہل علم دربار سے بے نیاز ہوچکے تھے اور مغل دربار کے اس رویّہ سے فارسی کا زوال شروع ہوچکا تھا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کی مسموم ہواؤں نے نہ صرف اس ہرے بھرے درخت کے سبز پتوں کا منہ زرد کردیا تھا بلکہ اس کی جڑوں تک زہریلے اثرات پھیلا دئے تھے جس کے اثرات ہندوستان کی تہذیب وتمدن کے تمام شعبوں پر بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طور پر پڑے۔شاعر جو کہ ملک کے فکری وجذباتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ان نامساعد حالات سے دوچار ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔اس سیاسی، سماجی اور معاشی طوائف الملوکی نے نہ صرف اس کا روزگار چھینا بلکہ اس کے قلب وذہن کو بھی جھنجھوڑ دیا۔

اورنگ زیب کی اس بے تعلقی اور نامساعد حالات کے باوجود بھی ہندوستان میں فارسی شاعری کی شمع دھیرے دھیرے روشن رہی اور بہترین ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔اس دور کی خصوصیات میں سب سے پہلا درجہ تصنع کے عنصر کا ہے۔اگرچہ قصیدہ گوئی تقریباً متروک اور غزل گوئی سب سے زیادہ مقبول تھی، مگر شاعر کا زور زبان اور خیال دونوں تصنع پر تھا۔اظہار ابلاغ کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی تھی۔وہ عموماً پیچیدہ، تمثیلی، استدلالی اور بڑی حد تک بیجان اور گنجلک ہوگئی تھی۔غزل میں خاص کر رومانیت اور سپردگی کا فقدان ہوگیا تھا۔اس کی جگہ فلسفیانہ قنوطیت طاری ہوگئی تھی۔تمثیل اور ایہام کا جابجا استعمال اس دور کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔

اس عہد کی سیاسی افراتفری اور مذہبیت نے ایک طرح کے منفی تصوف کو فروغ دیا جس میں فقر اور مادی دنیا سے بیزاری پر سب سے زیادہ زور دیا جارہا تھا۔اس دور کے کئی شعراء اور دانشور جیسے مرزا روشن ضمیر، مرزا فقیر اللہ، سیف خان، ہمت خان اور میر عبدالجلیل بلگرامی وغیرہ ہندی اور سنسکرت ادبیات میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔فارسی کے بہترین طنزیہ اور ہجویہ ادبی تخلیق کا سہرا بھی اسی دور کے سر ہے۔اس دور کے شعروادب نے زوال پزیر معاشرے کی جو جیتی جاگتی تصویر پیش کی اس کا جواب نہیں ہے۔اس عہد میں مثنوی نے ایک خاص رخ اختیار کیا۔محاکاتی یا بیانیہ شاعری کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال فلسفیانہ شاعری کے لیے بھی کیا جانے لگا۔عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کی مثنویاں اس سلسلہ میں خاص توجہ کی حامل ہیں۔ان میں کوئی خاص موضوع نہیں ہے بلکہ فلسفہ اخلاق اور تصوف کے بھکرے ہوئے موتی ایک جگہ پرودئے گے ہیں۔

عہد شاہ عالم میں انتشار، زوال اور انحطاط کے سبب سے دربار میں وہ فضا نہ قائم ہوسکی جو اس کے اسلاف کے زمانے میں تھی، اس لیے اس کا دربار علم وہنر کی تابانی اور فارسی شعروادب کے زمزمہ سنجی سے خالی رہا، گذشتہ عہد میں ایران سے علم وادب کا

جو سرچشمہ پھوٹا تھا، وہ تقریباً خشک ہو رہا تھا۔ قابل قدر فضلا ناپید ہو رہے تھے عبدالقادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات الصالحات میں رہ گئے تھے۔ صاحب مآثر الکرام نے بیدل کے بارے میں لکھا ہے:

''در مبدء حال نوکر شاھزادہ اعظم بن خلد مکان بود۔ و بمنصبی امتیاز داشت یکی از مقربان تعریف میرزا سمیع شاھزادہ رسانید۔ شاھزادہ فرمود۔ قصیدۂ در مدح ما انشا کند تا رتبۂ استعدادش دریافتہ باضافۂ منصب و تقرب سرافراز فرمائیم این خبر بمیرزا رسانیدند فی الفور از نوکری برداشت۔ ھر چند یاران مقید شدند کہ قصیدہ در مدح شاھزادہ توان گفت۔ سر انکار باز زد و نوکری را ترک دادہ در دارالخلافہ شاہ جھان آباد گوشۂ انزوا گرفت و بقیہ زندگانی بعنوان فقر و توکل بسر آورد۔'' (مآثر الکرام، حصہ اول، ص ۱۴۸)

اس دور میں اگرچہ ایرانی شان و شوکت باقی نہ تھی تاہم اب بھی مغلوں کا دربار علم و فن کا مرکز سمجھا جا رہا تھا۔ بہادر شاہ نے اپنے زمانے میں نعمت خاں عالی کو ''دانش مند خان'' کے خطاب سے سرفراز کیا، دانش مند خان اس عہد کی منظوم تاریخ ''بہادر شاہ نامہ'' لکھ رہا تھا کہ وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے بہادر شاہ کا ذکر شاعر کی حیثیت سے بھی کیا ہے اور بعض رباعیات اس کی طرف منسوب کی ہیں:

اعلی تر از آنی کہ علی خوانندت　　والا تر از آنی کہ ولی دانندت
بر ھستی خود گواہ می خواست خدا　　بی مثل بی افرید و بی مانندت

(تذکرہ روز روشن، ص ۳۸۱)

مرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان متخلص بہ واضح خان علم و فضل میں ممتاز تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے زمانے میں ارادت خان کا لقب پایا اور شاہ عالم کے عہد میں منصب چہار ہزاری سے سرفراز ہوا تھا۔ مآثر الامرا کے مصنف شاہ نواز خاں رقم طراز ہیں:

''مذاق بصوف دانش داشت۔ و در شعر بسیار نازک خیال بود۔ واضح تخلص می کرد۔ صاحب دیوان است۔ بیت

رشک فرمائی دلم نیست بجز عیش حباب
یافت یک پیرھن ھستی و آن ھم کفن است''

(مآثر الامراء، جلد اول، ص ۲۰۵)

بہادر شاہ کے زمانے میں قزلباش خان امیّد ہمدان سے ہندوستان آیا۔ اس نے اپنی یادگار ایک فارسی دیوان چھوڑا، ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، موسیقی میں بھی ماہر تھا، اس کے چند اشعار ذیل میں پیش خدمت ہیں:

چشم ما را بیا بر آب مکن　　خانہ ھمردمان خراب مکن
رو بہ آئینہ بردۂ زنھار　　ذرہ ھمچشم آفتاب مکن

(دیوان امیدؔ، (قلمی)، ق ۱۳۰.الف)

بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں بندرابن داس بہادر شاہی مصنف ''لب التواریخ'' کے علاوہ جگ جیون بھی تھا۔ بادشاہ نے اسے وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کیا۔ اس نے ''منتخب التواریخ'' لکھ کر بارگاہ شاہی میں پیش کی۔ اس کتاب کا اہم حصہ اس کا آخری باب ہے جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے حالات ہیں۔ ایک اور ہندو اہل قلم کامراج نے شہزادہ محمد اعظم کی فرمائش پر ''عظم الحرب'' لکھی، اس میں اورنگ زیب کے لڑکوں کی جنگ جانشینی اور محمد اعظم کی عارضی حکومت کا ذکر ہے۔

فرخ سیر کے عہد کے بہت ہی معروف و ممتاز عالم اور شاعر میر عبدالجلیل حسینی واسطی بلگرامی تھے۔ جو تفسیر، حدیث،

لغت، عربی ادب، تاریخ اور فن موسیقی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سید صباح الدّین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''فرخ سیر کے عہد میں ایک مرتبہ میٹھے اولے کی بارش ہوئی تو یہ رباعی کہہ کر اس کی خدمت میں پیش کی۔

فرخ سیر آن شہنشہ با برکات چرخ از ادب او شدہ شیریں حرکات
در سند یمن عہد عشرت مہدش بارید سحاب ریزۂ قند و نبات''

(بزم تیموریہ، جلد سوم، ص۹۴)

فرخ سیر کے دربار میں علم و فضل کا چرچا زیادہ نہیں رہا لیکن اس کے امراء کی علم دوستی اور ادب نوازی نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ نظام الملک آصف جاہ معقولات و منقولات کے عالم ہونے کے علاوہ بہت ہی قادر الکلام اور بلند پایہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ نظام الملک آصف جاہ کی علم نوازی اور فیاضی کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی اور ہر طرف سے علماء ان کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے۔ مآثر الکرام کے مؤلف آصف جاہ کے معاصروں اور ان کی مجلسوں کو زینت دینے والوں میں سے تھے۔ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''مستحقین را بہ خیرات و مبرات فراوان نواخت۔ از دفتر صدارت تحقیق نمودہ شد کہ سہ لکہ روپیہ بدستخط او سوای انعامات بادشاہی در صوبجات دکن بطریق یومیہ و در ماہہ بہ ارباب استحقاق می رسید۔ وسوای این قریب یک لکہ روپیہ بمردم حج رود غیر ہم رعایت می فرمود۔ سادات و علما و مشائخ دیار عرب و ماوراالنّھر و خراسان و عراق عجم و ھندوستان آوازۂ قدردانی استماع یافتہ روبہ دکن آوردند۔ و در خور قسمت خطی از احسان عام انداختند۔'' (مآثر الکرام، حصہ اول، ص۱۸۰۔۱۸۱)

علم نوزی اور معارف پروری کی جو شان دار روایات آصف جاہی خاندان کے بانی نے قائم کی تھیں، ان کو اس خاندان کے اور فرمارواؤں نے حیدرآباد میں آخری وقت تک اسی آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھا تھا۔ فرخ سیر کے درباری امرا میں مرزا عبدل المعالی عالی وزارت خان بھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ صاحب مآثر الامرا رقم زد ہیں:

''وزارت خان متخلص بہ گرامی.....بحسنات شگرف سرآمد اوان بود۔ طبع موزون داشت۔ صاحب دیوان است۔ این شعراز و مشہور۔

تا قافلہ سالار جنون فال سفر زد دیوانۂ ما دامن صحرا بہ کمر زد''

(مآثر الامراء، جلد اول، ص۲۶۷)

عہد محمد شاہ میں سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شان و شوکت جاتی ہی رہی، مغلیہ سلطنت اپنی زبان بھی کھو رہی تھی دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار ہو رہا تھا لیکن محمد شاہ کا دور اس لحاظ سے بہت ممتاز تھا کہ اس میں بڑے بڑے ارباب فضل و کمال جمع ہوئے تھے۔ فارسی شعرا میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان داؤد، علی قلی خان، شیخ سعداللہ گلشن، مرتضٰی خان فراق، میر شمس الدّین فقیر، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدّین خان آرزو، فائز، شہرت، صابر، مخلص، ریختہ گوئیوں میں نواب عمدۃ الملک، نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر، خان عالی خان، جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر ضاحک، میاں عبدالحئی تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جان جانان اور ہندی شعراء میں اعظم خان اور دیوکوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہادر شاہ کا دربار شعراء کا مرجع بنا ہوا تھا، بذلہ سنجیوں کی محفلیں برابر گرم رہتی تھیں، زمانے کے باکمال ارباب سخن اس کے یہاں جمع ہوتے اور علم پرور صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔

شیخ حسین شیرازی شہرت عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا، محمد اعظم کا طبیب مقرر ہوا، فرخ سیر نے اسے حکیم الممالک کا خطاب دیا، محمد شاہ کے عہد میں چہار ہزاری منصب سے سرفراز ہوا۔ حسین شیرازی نے ایک فارسی دیوان چھوڑا جس کے

اشعار ذہل میں ہیں:

نہ من شھرت تمنا دارم و نی نام می خواھم
فلک گر وا گزارد یک نفس آرام می خواھم
ای گل سر کوی تو جدا از وطنم کرد
من خار تو بودم بیروں از چمنم کرد

(مآثر الامراء، جلد اول، ص۲۰۲)

رائے آنند رام مخلص محمد شاہ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ قمر الدّین اور سیف الدولہ کا دربای وکیل مقرر ہوا۔ مخلص کا شمار ان چند شعرا میں کیا جاتا ہے جو فارسی علوم وفنون کے بڑے دل دادہ شیدائی تھے۔ مخلص نے اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لیے متعدد تصانیف مثلاً گلدستۂ ابرار، بدائع ووقائع مخلص، مراۃ الاصطلاحات، رقعات مخلص، سفر نامہ، پری خانہ، چمنستان، ہنگامہ عشق، کارنامہ عشق، روزنامچہ احوال، رباعیات اور دیوان یادگار چھوڑیں ہیں۔ اس کے چند اشعار ذیل میں ہیں:

قیامت بر سرم آوردہ ای از شیون ای قمری
تو خواھی بعد از ین در باغ بودن یا ای من قمری

(ریاض الشعرا، ص۷۰۶)

لال رام کا تعلق محمد شاہ کے دربار سے تھا۔ اس نے ''تحفۃ الہند'' ایک مستند تاریخی کتاب لکھ کر دربار شاہی میں بطور تحفہ پیش کی۔ یہ فرخ سیر کے عہد تک ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ ہے۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عالم گیر ثانی شاعری کا بڑا دلدادہ تھا اور سخن گوئی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کا تخلص ''آفتاب'' تھا جس کا شاعر مرزا فاخر مکین نے انتخاب کیا تھا۔ آفتاب کو فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی چاروں زبانوں میں قدرت تھی اور ان زبانوں میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف فارسی کا برجستہ اور حاضر جواب شاعر تھا بلکہ ریختہ گوئی میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ اس نے ایک غزل نما قطعہ اپنے اندھا کیے جانے کے بعد لکھا تھا جو بڑا پر اثر ورقت انگیز ہے جس کے چند اشعار بطور مثال حسب ذیل ہیں:

آہ چہ حادثہ برخاست پی خواری ما — داد بر باد سرو برگ جھاندارئی ما
آفتاب فلک رفعت شاھی بودم — بر در شام زوال آہ سیہ کارئی ما
چشم من کندہ شد از جور فلک بھتر شد — کہ نہ بینم کہ کند غیر جھاندارئی ما
داد افغان بہ چہ شوکت شاھی برباد — کیست جز ذات خسائی کہ کند یارئی ما

(بزم تیموریہ، جلد سوم، ص۱۰۹)

شاہ عالم ثانی ہی کے عہد میں میر شمس الدّین فقیر عبّاسی دہلوی اپنے عہد کے ایک ممتاز اور باکمال فارسی شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایام طفولیت اورنگ زیب کے عہد میں گذارے اور ان کی جوانی محمد شاہ کے عہد میں گزری۔ خان آرزو اور دیگر نقادوں نے بھی ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ بعض نقاد نے تو یہ کہا ہے کہ اس عہد میں فقیر کے مثل ہندوستان میں کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ فقیر دہلوی خود رقم طراز ہیں:

''لذت قند مکرری دھد شعر فقیر''

(دیوان فقیر، (قلمی)، ق۳۳ الف)

آخری مغلیہ دور میں فارسی ادب میں ایک نئی صنف سخن ''تنقید گوئی'' وجود میں آئی جو اس سے قبل نظر نہیں آتی۔ اس نے فارسی ادب میں ایک باب نو کا اضافہ کیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عہد مغلیہ کا سورج نصف النہار اور غروب کے مترادف نظاروں کی طرح آخر میں زوال اور پستی کے طولانی مراحل سے بھی گزر رہا ہے۔ اس کی جھلک بعد کے دور کے شعر و ادب میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ بعض شعرا کا کلام ان کے معاشرے کی فکری پراگندگی، احساس کی مفلسی اور جذبات کی تھکاوٹ سے متاثر نظر آتا ہے۔ آخری دور کے شعرا یاس اور قنوطیت میں گرفتار ہو گئے یا ایک ایسے تصوف کی طرف مائل ہو گئے جو حیات کی فعال قوتوں سے منہ پھیرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا قلم جو الفاظ اور اصطلاحات تراشتا ہے ان کی مثال جھوٹے نگینوں کی سی ہے۔ جن سے نظر سیراب نہیں ہوتی ان کا آہنگ اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے شعر و ادب پر زوال کے آثار کا سرخ نشان چسپاں ہے۔ شاعر زندگی کو ایک بوجھ سمجھ کر بیچارگی کے ساتھ قبول تو ضرور کرتا ہے مگر وہ اس جام کو آخری گھونٹ تک تلخی اور شیرینی کے ساتھ پینے کا قائل ہے۔

اس عہد میں تنقید کے ساتھ ساتھ اکثر علمی مباحثہ بھی ہوتے تھے۔ اس علمی مباحثہ اور اعتراضات نے آہستہ آہستہ آگے چل کر ''معرکہ گوئی'' کا نام حاصل کر لیا۔ اس طرح شعرا کے دو گرہوں کے درمیان بحث و مباحثہ، تکرار اور مضمون بازی ہوتی۔ ان معرکوں نے اس عہد کے فارسی ادب کے ماحول کو خاصا سرگرم رکھا۔ اس عہد کی دوسری سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس عہد میں فارسی شعرا، ادبا اور علما کے تذکرے کثیر تعداد میں وجود میں آئے۔ اس عہد میں تذکروں کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی ایسی متعدد لغات بھی مرتب ہوئیں جو آج خود ایران میں مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کے بارے میں بھی متعدد و مستند کتابیں تالیف و تصنیف ہویں جو یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ اس عہد کے بیشتر شعرا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے جو اس دور کا خاصہ تھی۔ اگر چہ آخری مغلیہ دور میں فارسی زبان و ادب روبزوال تھی لیکن اس کے باوجود اس کی ادبی، علمی اور تہذیبی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ فارسی زبان و ادب کے متوالے اور باذوق افراد اپنے علم و ہنر کی جولانیاں صفۂ کاغذ پر بکھیرتے رہے۔

مآخذ

۱۔ فقیر دہلوی، میر شمس الدّین، دیوان فقیر، (قلمی) مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، نمبر ۹/۷۷/۴

۲۔ آزاد بلگرامی، غلام علی، مآثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد، (تذکرۂ شعرای فارسی) فصل اول، تصحیح و تحشی عبداللہ خان و بہ اہتمام مولوی عبدالحق، کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد ۔۱۹۱۳م

۳۔ صبا، محمد مظفر حسین، تذکرۂ روز روشن، تصحیح و تحشیہ محمد حسین رکن زادۂ آدمیت، کتابخانہ رازی میدان بہارستان، تہران، ۱۳۴۳ش

۴۔ شاہنواز خاں (نواب صمصام الدولہ) مآثر الامرا، بہ تصحیح مولوی عبدالرحیم، جلد اول، اردو گائیڈ، کلکتہ۔۱۸۸۸م

۵۔ امیّد، قزلباش خان، دیوان امیّد، (قلمی) مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، نمبر ۲/۱۷/۴

۶۔ سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، جلد سوم، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند) ۲۰۰۹م

۷۔ فقیر، میر شمس الدّین، مثنوی دُرّ مکنون، (قلمی) مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، قطب الدّین کلکشن، نمبر ۱۲/۴۵ اف

۸۔ والہ داغستانی، علی قلی خان، ریاض الشعرا، مقدمہ تصحیح و ترتیب پرفسور شریف حسین قاسمی، رضا لائبریری، رام پور۔۲۰۰۱م

ڈاکٹر محمد عمر
گیسٹ لکچرر، شعبہ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

امیر خسرو کی مثنویوں میں ہندوستان

نے گلم نے بلبلم نے شمع نے پروانہ ام
عاشق حسن خودم بر حسن خود دیوانہ ام

فارسی شاعروں نے خواہ وہ ایران سے مہاجرت کر کے ہندوستان آئے ہوں یا پھر ہندوستانی ہوں اپنے کلام میں ہندوستانی رسم و رواج، رہن سہن کھانا پینا، آب و ہوا، شہر و دیہات، درختوں پہاڑ، ندیاں وسمندر وغیرہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ان سے پہلے کے بھی شاعروں نے اپنی شاعری میں پھل پھول، سڑک راستوں اور پیڑ پودوں کی تعریف و توصیف کا استعمال کیا ہے، ان خوش نصیب شعراء کی فہرست میں ایک نام حضرت امیر خسرو دہلوی کا بھی ہے۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کے بارے میں لکھا ہے۔

There have been in the history of the world but few instance of scholar or a poet acquiring a popularity and a fame like those of Khusrau.We may think,perhaps,of Byron and Shakespeare in England,of Goethe in Germany, and of Sa'di in Persia.But it was the personality of Khusrau,his ready wit ,his flowing humour,his verstile genius and his amiable disposition,rather than his poetry,that rendred him known all over India.Centuries have elapsed since the 'Parrot of India' sang his last long and the voice that had charmed princes and peasants was hushed for ever, yet the memory of his name is as fresh today as ever(1)

امیر خسرو فارسی کے ایک مشہور شاعر ہیں جن کا تعلق ادب پرور اور ادب نواز شہر دہلی سے ہے ان کی ذات مبارک محتاج تعارف نہیں وہ حضرت نظام الدّین اولیاء کے رفیق، بہت سے سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے، آپ کو شاعری میں دسترس تو حاصل تھی ہی فن تاریخ میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا اور ان کی تاریخ سے بعد کے مؤرخین نے استفادہ کیا علاوہ اس کے فن موسیقی سے بھی کافی لگاؤ تھا۔

امیر خسرو کی ''موسیقی'' کے بارے میں شکیل الرحمٰن رقمطراز ہیں:

''ہندوستانی'' موسیقی میں امیر خسرو کا نام ایک ''دلچنڈ' اور ایک متحرک خوبصورت روایت ہے۔ موسیقی میں ان کے تخلیقی کارنامے غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ایک تخلیقی موسیقار تھے کہ جنھوں نے ہندوستانی موسیقی میں انتہائی عمدہ اور نفیس تجربے

کئے، ایسے تجربے جو آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، امیر خسرو اپنی پوری صدی کے موسیقاروں میں بلند درجہ رکھتے ہیں، ان کا قد اونچا نظر آتا ہے، ایک ایسے جی نی ایس کی پہچان ہوتی ہے کہ جس نے اپنی اعلیٰ اور نفیس روایتوں کا رس پیا ہے اور اپنی تخلیقی فکر و نظر سے اس میں اور شیرینی اور مٹھاس پیدا کی ہے، بلاشبہ امیر خسرؔو کلاسیکی ہندوستانی موسیقی کی نئی تاریخ کے عنوان ہیں، فن موسیقی پر انکی نظر جتنی گہری ہے اسکی مثال نہیں ملتی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی موسیقی کو از سر نو زندہ کیا اور اس موسیقی کو نئے انداز سے مرتب کیا، ہندوستانی موسیقی کو نئے آہنگ اور نئے بولوں اور گیتوں سے آشنا کیا، وہ نئے تغزل اور نئی غنائیت کے خالق ہیں''(۲)

امیر خسرو خود ہندوستانی موسیقی کی اہمیت اور اس سے برآمد نتیجہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب و نظر اور روح کو جلاتی ہے'' (۳)

امیر خسرؔو ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ان کی ہمہ گیر شخصیت نے عوام میں انہیں قبول عام کا درجہ دیا ہے۔ ایک طرف وہ فارسی زبان کے باکمال شاعر ہیں تو دوسری طرف ہندی، سنسکرت، گجراتی وغیرہ زبانوں پر بھی اہل زبان کی طرح قدرت رکھتے ہیں، فارسی زبان میں ان کا وہ مرتبہ ہے کہ اہل ایران بھی ان کے زبان دانی کے معترف ہیں اور ان کو ''طوطی ھند'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

امیر خسرؔو کی وطن دوستی اور وطن پرستی مثالی ہے، ان کے دل میں اتحاد اور وطن کی عظمت کا جزبہ موجزن تھا۔ جب ۷۱۸ ھجری میں امیر خسرؔو اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' تالیف کی تو اس میں ''حب الوطن من الایمان'' کو حدیث پیغمبر ثابت کر دیا اور کہہ دیا کہ ہندوستان زمیں پر جنت کے مانند ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب جنت سے باہر نکالا گیا تو انہیں سرزمین ہند پر بھیجا گیا کیوں کہ صرف ہندوستان ہی جنت کا نعم البدل تھا۔ ہندوستان میں خالق کائنات نے مختلف قسم کے نباتات، جمادات انواع و اقسام کے چرند و پرند کا ٹھکانہ بنایا مثلاً ہندوستان ہی میں نزول آدم، نزول حجر اسود، مور اور سانپ وغیرہ بہت سی اشیاء سے ہندوستان کی تزئین فرمائی، جس کا ذکر مشہور مؤرخین و ادباء نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے تو اپنی تصنیف میں باقاعدہ اس پر بحث کی ہے۔

امیر خسرو نے ہندوستان کے ایک پرندہ ''طوطا'' جو ایک خوش رنگ اور خوبصورت پرندہ ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فاتح و اخلاص و دعا در دہنش　　با من و تو ہم چو من تو سخنش

یعنی اسکی زبان پر سورہ فاتح اور اخلاص رہتی ہے اور وہ ہماری تمہاری طرح باتیں کرتا ہے۔ طاؤس بھی ہندوستان کا ایسا پرندہ ہے جو خوبصورتی میں بے مثال ہے خسرؔو نے طاؤس کی تعریف میں جگہ جگہ نغمیں گائے ہیں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

گر نہ بہشت است ہمیں ہندمر　　از پے طاؤس جناں گشت مرا

امیر خسرؔو اپنی وطن پرستی کا ثبوت اس طرح پیش کرتے ہیں:

آنست یکی کین زمین از دور زمن　　ھست مرا مولد ماوئ و وطن
وین ز رسول آمدہ کای زمرۂ دین　　حب وطن ھست ز ایمان بہ یقین
دومش آن کین زمین از قطب زمن　　ہست چو راجح ز ھمہ ملک جہان

گر نہ بہشت است ھمین هند،چرا | از پئ طاؤس جنان گشت سرا
جتم اینست سوم گر بہ شکی | کآمد ن مار زباغ فلکی
گر نہ بہشت است همہ هند،چرا | در حدش آن بار نیفتاد روا(۴)

امیر خسرو سنسکرت زبان کو آسمانی زبان مانتے ہیں کیوں کہ چاروں ویداسی زبان میں ہیں اس لئے سنسکرت مقدس زبان ہے خسرو سنسکرت زبان کو عربی کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں پر فوقیت دیتے ہیں اسلئے کہ سنسکرت ایک ایسی زبان ہے جو کسی دوسری زبان کی محتاج نہیں اسکی گرامر اور قواعد دیگر زبانوں سے مختلف ہے اسے ہندوستانی برہمن بخوبی جانتے ہیں عمومی اعتبار سے ہندوستانی لوگ اپنی علاقائی زبانیں بولتے ہیں۔

امیر خسرو''مثنوی نہ سپہر'' میں لکھتے ہیں:

لیک زبانی است دگرکز سخنان | آنست گزین نزد ہمہ برہمنان
سنسکرت نام ز عہد کہنش | عامہ ندارد خبر از کن مکنش(۵)

اپنی ایک اور مثنوی''دول رانی خضر خان'' میں تحریر کرتے ہیں:

بجز تازی کہ پیرہر زبانست | کہ بر جملہ زبانہا کامرانست
دگر غالب زبان دری و روم | کہ نآمیزد رو گفتار دیگر
زبان هند هم تازی مثال است | کہ آمیزش درآنجا کم مجال است(۶)

امیر خسرو کو ہندوستانی تہذیب اور وہاں کا تمدن اور خاص طور سے اہل وطن ہندوؤں کا اپنی عورتوں کو''ستی'' کر دینا بہت متاثر کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو شوہر کے عدم موجودگی میں زندگی گذارنا بے محل سمجھتی ہے اس لئے وہ اپنی زندگی شوہر کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم کر دیتی ہے امیر خسرو اپنا تاثر اسطرح بیان کرتے ہیں۔

هست عجب مردن هند و بہ وفا | مردنش از تیغ و ز آتش بہ جفا
گر چہ در اسلام روا نیست چنین | لیک چو بس کار بزرگ است این(۷)

امیر خسرو اہل علم وفضل اور ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا بھی جا بجا ذکر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسے ایسے علماء پائے جاتے ہیں جو علم ودانش میں یونانی فلسفی ارسطو کا دفتر بھی چاک کر سکتے ہیں۔مثلاً وہ کہتے ہیں:

برہمنی ہست کہ درعلم وخرد | دفتر قانونِ ارسطو بدَرَد(۸)

باشندگان دہلی بھی امیر خسرو کی نگاہ میں بڑے محترم ومحتشم ہیں، وہ فرشتہ صفات ہیں اور اہل بہشت کے مانند خوش اخلاق وخوش اطوار ہیں، ساری دنیا کے باشندوں میں انفرادی طور پر جو صفات ہیں وہ سب کی سب بلکہ ان سے افزوں باشندگان دہلی کی ذات میں مجتمع ہے :

مردم او جملہ فرشتہ سرشت | خوش دل وخوش خوی چو اہل بہشت
ہر چہ ز صنعت بہ ہمہ عالم ست | اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند(۹)

خسرو کی قومی یکجہتی اور انکی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی نمایاں تصویر اور ہندوستانی سنگیت سے پوری طرح واقفیت اور انسیت کو بھی ظاہر کرتی ہے انہیں صرف سنگیت سے ہی دلچسپی نہیں تھی بلکہ انھوں نے اسے ایک نیا موڑ بھی دیا اور بہت سے نئے راگ ایجاد کئے، فارسی اور ہندوستانی موسیقی کی آمیزش سے ہندوستانی سنگیت کو تازگی بخشی جب تک ہندوستانی

سنگیت زندہ ہے تب تک خسرو کا نام باقی رہے گا۔

کسی بھی شاعر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے، اس قول کی تصدیق خسرو کی شاعری سے ہوتی ہے ان کے کلام میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کا سنہرا عکس نظر آتا ہے۔ سیاسی اخلاقی تصویروں کا مکمل نقشہ اور زندگی کی رنگارنگ جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ہندی زبان میں ان کی کہانیاں، کہاوتیں، ہندی اور ہندوستانی باشندوں سے انکے عشق کو ظاہر کرتی ہے اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آنے والی نسلیں بھی مستقبل میں امیر خسرو کے کلام سے مستفیض ہونگی۔

فہرست منابع و مآخذ:

۱۔ دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، ص:۲۳۲، دہلی، ۱۹۷۴

۲۔ امیر خسرو کی جمالیات، ص ۲۱ تا ۲۲، نئی ہلی، ۱۹۹۶ عیسوی

۳۔ مثنوی نہ سپہر، ص، کلکتہ، ۱۹۱۸ عیسوی

۴۔ مثنوی نہ سپہر، ص:۱۴۸ تا ۱۵۷، کلکتہ، ۱۹۱۸ عیسوی

۵۔ ایضاً، ص:۱۷۸ تا ۱۸۱

۶۔ مثنوی دول رانی خضر خان، ص:۴۱ تا ۴۲

۷۔ مثنوی نہ سپہر، ص:۱۹۴ تا ۱۹۵

۸۔ مثنوی نہ سپہر، ص،

۹۔ مثنوی قران السعدین، ص:۳۴

اظہار احمد
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

عصر حاضر میں تصوف شاہ ولی اللہ کی معنویت

چکیدہ: جس طرح ہر چیز کا ظاہر و باطن ہوا کرتا ہے اسی طرح شریعت کا معاملہ سے امور ظاہر یہ کا نام شریعت اور امور باطنہ کا نام طریقت ان دونوں کی حیثیت بدن اور روح کی ہے۔ عبادت لازمہ کی ادائیگی سے ظاہر شریعت کی تعمیل ہوتی ہے وہیں اوراد و اذکار تسبیحات و وظائف سے روح شریعت یعنی طریقت کی تکمیل ہوتی ہے یعنی تصوف کمال شریعت کا لازمہ ہے اور بدون شریعت تصوف کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے شاہؒ کی تصوف سے متعلقہ کتابیں انہیں رموز و نکات کی نشاندھی کرتی ہے جسے الطاف القدس۔ نفحات ،ھمعات۔ البلاغ المبین جیسی معرکۃ الاراء تصانیف میں بغایت توضیح و تفصیل مزین کیا گیا۔

کلیدی الفاظ: شاہ ولی اللہ، تصوف، صوفیانہ کردار، اوصاف صوفی، مراعات مجلس

تصوف اور سلوک کا امور شریعہ میں کمال حاصل کرنے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ جس طرح بدن اور روح کا رشتہ ہوتا ہے کم و بیش یہی کیفیت شریعت و طریقت کی ہے جس طرح بغیر بدن کے روح کا تصور نہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر شریعت کے طریقت کا تصور محال و محظور ہے شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ ۱۱۷۶ھ) عالم اسلام کی ایک عبقری شخصیت ہیں جو نہ صرف ایک عظیم محدث و مفسر بلکہ ایک بزرگ صوفی ہیں جن کی جامعیت و معنویت کی بناء پر عالم اسلام کے تمام مکاتب فکر اور روحانی سلسلوں کے مرکز کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ آپ کو اللہ تبارک و تعالی نے علوم و معارف 'طریقت شریعت' رشد و ہدایت' سیاست و سیادت کی مسند نشینی عطا کی وہ اسلامی دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے آپ عزم و استقلال کے پہاڑ اور قحط سالی میں تھاٹھیں مارنے والے دریا تھے جس کا ثبوت آپ کی تحریرات ہیں کہ سلطنت مغلیہ سیاسی انتشار سے دوچار تھی ہر طرف مصائب و حوادث کے گرد و غبار اڑ رہے تھے۔ رنج و الم ظلم و ستم کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور شاہ اس ھیجانی کیفیت میں تصنیف و تحقیق اور تعلیم و تربیت میں اس طرح مصروف تھے کہ جیسے عالم سکینت و دنیائے طمانیت میں مسند نشین ہوں اور راحت و اسائش سے آزاد فکر مولانا ابوالحسن علی الندوی آپ کی ثابت قدمی جوان مردی ہمت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں (شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پر آشوب زمانہ کی پیداوار ہے جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی۔ صرف یہ معلوم ہوگا کہ علم و فضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے جو زمان و پاک کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے (تاریخ دعوت و عزیمت ص۔۲۱۲))

ان مہتم بالشان تصانیفی ذخیرہ میں تصوف سے متعلق کتابوں کا ایک بڑا حصہ نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب سلسلہ نقشبندیہ سے متعلق ہیں مگر دیگر سلسلوں کو بھی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ان تمام میں الگ الگ خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لئے آپ کا نظریہ تصوف دیگر راہیان تصوف سے یکسر جداگانہ ہے آپ کی تصوفی کتابیں تزکیہ نفس علم و حکمت اور خردمندی کی شاھکار

ہیں۔آپ نے ان کے ذریعہ تصوف اسلامی اور تصوف جاہلی کے درمیان ایک سرخ لکیر کھینچ کر حد فاصل قائم کیا آپ نے تصوف سے متعلق الطاف القدس'الانتباہ فی سلاسل الاولیا'ھمعات' تفہیمات الھیہ' کشف العین عن شرح الرباعتین تمام فارسی اورالقول الجمیل فی سواء السبیل'فیوض الحرمین (عربی) جیسی معرکتہ الاراء کتابیں تحریر فرما کر تصوف اور اس کے بنیادی ڈھانچہ سے روشناس کرا کر افکار باطل پر قدغن لگایا نیز تصوف کو قرآن وحدیث کے عین روح کے مطابق قرار دیا اور اپنی بات کو آیات قرآنیہ سے مضبوطی دیتے ہیں بالخصوص آپ آیت کریمہ وَذَرُواْ ظَاهِرَ الإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (سورۃ انعام آیت نمبر 120) کو اپنا متدل بناتے ہوئے صاحب تصوف کا اصل مقصد اصلاح حال اور تزکیہ نفس قرار دیتے ہیں نیز بطور استشھاد ویـزکیهـم ویعـلـمهـم الکتـاب والحـکمة پیش فرماتے ہیں۔شاہ عارف کے لئے دوراستے لازم قرار دیتے ہیں جو کہ حدیث پاک کی روشنی میں نظر آتے ہیں آپ لکھتے ہیں(اعـلـم ان العـارف له الی الله تبارك تعالی طریقان طریق الوسائط و طریق الاوسائط فیها والیـه اشارة فی قوله صلی اله علیه وسلم من ذکر فی نفسه ذکرته فی نفسی و من ذکر فی ملأ ذکر ته فی ملأ خیر منـه (تفھیمات الالھیہ۔ج ا ص ۳۷/۳۸) نیز شاہ صاحب صوفیاء کے مجلسوں کے لئے آداب مقرر کئے ہیں کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجلس میں بیٹھنے کے لئے آداب اور اصول ہوتے تھے صوفیاء کی مجلسوں میں بھی وہ آداب ملحوظ نظر رکھے جائیں اور آیت کریمہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ (الحجرات آیت نمبر 2) یہ ایت کریمہ ایک خاص کیفیت اور شان رکھتی ہے۔مگر یہ شان اس کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ اپنے بندوں کو آداب مجلس سکھلاتا ہے۔اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے آیت شریفہ آپ سے چاہتی ہے کہ اگر مجلس میں ہوں تو اس میں بڑوں کا خیال رکھا جائے۔اگر بات کرنی ہو تو ایسا اسلوب اور لہجہ اپنایا جائے جس سے دوسروں کو الجھن نہ ہو۔محمد مشتاق صاحب نے شاہ صاحب کے بیان کردہ آداب میں سے چند کا تذکرہ اپنے مقالہ شاہ ولی اللہ اور مناہج تصوف میں کیا ہے(وہ آداب جو ایک مرید کے لئے ضروری ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1. شیخ کی صحبت میں باادب ہو کر نہایت عاجزی سے خاموش بیٹھا رہے اور اس کے کلام قدسی کو غور سے سنتا رہے۔
2. مرشد کی موجودگی میں ھمہ تن اس کی طرف متوجہ رہے تاکہ شیخ کی نگاہ شفقت حاصل ہو۔
3. شیخ کی مجلس میں بیٹھ کر وظیفہ وغیرہ میں مشغول نہ ہو اگر اس وقت کچھ پڑھنا لازم ہو تو اس کی نظر سے پوشیدہ بیٹھ کر پڑھے۔
4. مرشد کے سامنے مختصر اور نرم گفتگو کرے اور کوئی بات ایسی نہ کہے جو پیر کی سبکی اور گرانی کا سبب بنے۔
5. دل میں کوئی شبہ گذرنے کی صورت میں فورا مناسب طریقہ سے عرض کردے اگر وہ شبہ حل نہ ہو تو اپنی فہم کا قصور سمجھے۔
6. جس جگہ مرشد بیٹھا ہوا ہو اس طرف پاؤں نہ پھیلائے اور اس کی طرف منہ کر کے نہ تھوکے اگرچہ سامنے نہ ہو۔
7. حسب استطاعت جان و مال سے شیخ کی خدمت کرے اور اس پر احسان نہ جتائے بلکہ جتنی بھی خدمت کرے خلوص و للھیت سے کرے۔(ماھنامہ براہین ص ۱۸۶)

شاہ صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ روحانی اور باطنی سکون اسی تصوف کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ روحانی اور باطنی سکون اللہ اور اس کے رسول کی کماحقہ اطاعت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے نیز شاہ صاحب تصوف اور احسان کو ایسے علم سے تعبیر کرتے ہیں جس میں ذات وصفات باری تعالی سے بحث کی جائے اور ایسے اعمال واوراد کو اپنا مشغلہ بنایا جائے جن سے ظاھر و باطن کی صفائی یعنی تزکیہ وتصفیہ باطن متحقق ہو جو امتہ وسطہ کا آئینہ ہو۔افراط وتفریط سے پاک ہو۔جسے اللہ تبارک و

تعالی نے صراط مستقیم نام دیا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر الامور اوسطھا کہ کر نشان زد کیا پھر خیر امر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے نظر آئے گا۔ رسولؐ کے اسوہ اور صحابہ کرام کی زندگی سے ھٹ کر جو چیزیں گروہ تصوف میں آ چکی ہے ان کا تصوف سے دور کا واسطہ نہیں ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے فتوح الغیب میں صاف لفظوں میں قرآن اور حدیث کو ہر کامیابی کا نسخہ قرار دیا اور اسی کو دستور العمل سمجھنے کی ترغیب بھی دی چنانچہ لکھتے ہیں: اجعل الکتاب والسنة امامك و انظر فیهما و تدبر واعمل بهما ولا تغتر بالقال و القیل و الهوس

امام ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ فرمان ان تمام گروہ ضالہ کے عقاید و رسومات کے خلاف حجت ہے جو غفلت و جہالت کی دریا میں مستغرق ہو کر تصوف کے پاکیزہ راستہ میں تضادات و بدعات داخل کر رہے ہیں جنہیں العوام کالانعام نے عین تصوف سمجھ لیا اور آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جنہیں قرآن اور حدیث سے دور کا واسطہ نہیں آثار صحابہ اور احوال اولیاء کی خبر نہیں وہ مسند خلافت پر براجمان ہیں اور اپنی کم بضاعتی اور کج فہمی کے باوجود تصوف و احسان کے ٹھکیدار بن گئے ہیں اپنے کو صوفی اور دوسروں کو کوفی بنا رکھا ہے جنہیں یہ معلوم نہیں کہ صوفیاء کرام نے کیا خدمات انجام دیں انہوں نے کس طرح اسلامی معاشرہ کو زوال سے بچایا۔ ہوا مخالف کے سامنے کیسے سینہ سپر ہوئے اور اپنی روحانی فیضان کے ذریعہ بیشمار اقوام غیر کو رشد و ہدایت کی قندلیں دکھائیں۔ یہی وجہ ہے جو بھی سلیم الطبیعت اور کریم الفطرت ہے جب ان صوفیاء کرام کے احوال و سیر کو پڑھتا ہے تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ تصوف شریعت کی اصل روح اور عین مطلوب ہے اور یہی میراث نبوی ہے۔ الغرض یہ بات مسلم ہے کہ تصوف امور شرعیہ کے انجام دھی میں درجہ کمال اور نتیجہ مال کو بتلاتی ہے کہ اقامت نماز' روزہ وزکوۃ اور صدقات وخیرات کے ساتھ تزکیہ قلوب کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ عصر حاضر میں ارشاد ربانی! رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (سورہ البقرہ آیت نمبر ۱۲۹) اور آیت كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ (سورہ البقرہ آیت نمبر ۱۵۱) بر عمل آوری اور تزکیہ وتصوف کی معنویت دوگنا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ فی زمانہ نمازیوں روزہ داروں اور حاجیوں کا معاملہ ایسے مریض کی طرح ہو گیا ہے جو اوپر سے ہٹے کٹے لحیم وشحیم تو ہیں مگر باطنی طور سے قلب و جگر گردہ و پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا ہیں جن سے نجات پانے کے لئے ماہر ڈاکٹرس کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور ان کی تجویز کردہ دواؤں کو کیمیا سمجھ کر نوش کرتے ہیں۔ اسی طرح ان باطنی مریضوں کو بھی کرنا ہوگا جو ظاھری طور سے امور شرعیہ کے پابند تو ہیں مگر اخلاص' تقوی سے عاری ریا ونمود سے لبریز ہیں کبر و نخوت حب جاہ وطلب شہرت نفاق وشقاق ان کے اندر جڑ بنا چکا ہے لہذا ان باطنی بیماریوں سے بچاؤ کا واحد طریقہ ہے کہ راہ تصوف کو اپنایا جائے تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کی جائے مالک حقیقی کی شناخت اور تمام نفع ونقصان تکلیف وراحت میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے توکل علی اللہ اور دامن صبر کو مضبوطی سے تھاما جائے رحمت خداوندی کا امیدوار عذاب الہی سے اندیش وار بنا جائے تمام کارہای دینی رضا الہی اور اتباع سنت کو ملحوظ نظر اور باعث کامیابی وظفر جانا جائے یہ تمام بلند درجات اللہ تبارک وتعالی کی جملہ مخلوقات میں غور وفکر "مشاہدہ کائنات" "خود کی پہچان" عرفان نفس' استفادہ قرآن' مطالعہ حدیث' عبادات اور ذکر واوراد کے ذریعہ حاصل کی جائیں کیوں کہ اوراد واذکار کو اصل عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے الدعاء مخ العبادہ (جامع ترمذی حدیث نمبر ۳۳۷۱) دعا عبادت کی جڑ ہے۔ نیز کلام الہی بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے ارشاد ربانی وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۸۶) اے نبیؐ جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو انہیں بتا دو کہ میں نزدیک ہوں اور آواز دینے والے کی آواز کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کی روح پانے کے لئے فکر آخرت، احتساب نفس اور اللہ

کی طرف رجوع اور ہر صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے توبہ بھی ضروری ہے۔احتساب نفس' فکر آخرت' گناہوں سے توبہ اور رجوع الی اللہ کی اہمیت کلام باری تعالی سے نمایاں ہوتی ہے یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَی اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحاً (سورۃ تحریم آیت نمبر ۸) اے ایمان والوں اللہ سے سچی توبہ کرو سچی توبہ سے مراد زبان سے اظہار معذرت اور قلب سے ندامتی کیفیت پیدا ہو۔

پس شاہ صاحب کے نظریہ تصوف سے واضح ہو گیا۔کہ تصوف تزکیہ نفس تطہیر باطن اور ادراک الٰھیات بالاسباب کا نام ہے جو تمام فرائض وواجبات سنن نوافل کی انجام دہی مشاہد کائنات' مطالعات حدیث' عرفان ذات خود اور استفادہ قران کے ساتھ ساتھ فکر آخرت' احتساب نفس اور توجہ ورجوع الی اللہ سے کمال پاتا ہے۔لہذا عصر حاضر میں رائج تصوف جسے چند مفاد پرست طبقوں نے رقص وسرود' سماع وقوالی کا نام دے رکھا ہے اسے مٹایا جائے اور اسلامی تصوف کو اپنا کر اس طرح عام رواج دیا جائے کہ مناہج تصوف اور اس کی روحانیت کی تعیین وتشخیص ہو جائے اور آب آمد تیمّم برخواست : روز آمد شب گذشت کا مصداق بنے جس زور سے اسلامی تصوف کو اپنایا جائے گا اور اس کا چرچہ علمی و روحانی مجلسوں میں کیا جائے گا اسی زور سے کور باطن جاہل ملاؤں کی کج روی پر قدغن لگے گا اور ان کا غبار آلود تصوف روشن تصوف سے زوال پذیر ہوگا۔پس عصر حاضر میں لازم ہے کہ فکر ولی اللھی کی نشر و اشاعت کو ناگذیر جانا جائے اور بناء تصوف اسی پر قائم کیا جائے جو اقرب الی القرآن والسنہ ہے۔

منابع وماخذ

1۔تاریخ دعوت وعزیمت ج۵/۲۱۲ مولانا ابوالحسن علی الندوی سال 1997 طباعت درالاشاعت ندوۃ العلماء لکھنو

2۔سورہ انعام آیت نمبر 120۔کلام باری تعالی

3۔التفھیمات الالھیہ۔ج اص ۳۷/۳۸۔شاہ ولی اللہ ۱۲۳۸ھ تعداد صفحات ۶۸، کتب خانہ سلطان التجارت مقبول پریس دہلی، ۱۱۸۶ھ

4۔الحجرات آیت نمبر 2۔کلام باری تعالی

5۔ماھنامہ براہین ص ۱۸۶ ماہ اپریل 2017۔مرب عطاء الرحمان قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ دھلی

6۔سورہ البقرہ آیت نمبر ۱۵۱۔کلام باری تعالی

7۔جامع ترمذی حدیث نمبر ۱۳۳۷ ابوعیسی محمد الترمذی۔حافظی بک ڈپو دیوبند۔ سال اشاعت مختلف

8۔سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۸۶۔کلام باری تعالی

9۔سورۃ تحریم آیت نمبر ۸۔کلام باری تعالی

منظور بھٹ
کشمیر

پیرغلام حسن کھویہامی اور تاریخ حسن

پیرغلام حسن شاہ کھویہامی ۱۸۳۳ء بمطابق ۱۲۴۹ھ موضع گامرو بانڈی پورہ میں تولد ہوئے۔ غلام حسن شاہ کے والد صاحب یعنی حافظ غلام رسول شیوا خود ایک باکمال صوفی ہونے کے علاوہ عربی اور فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ جنہوں نے ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء رحلت پائی۔ انہوں نے اپنے کلام کو ''مجموعہ شیواہ'' کے نام سے یادگار چھوڑا ہے۔ جو علمی اور ادبی لحاظ سے قابل قدر اور اعلیٰ کارنامہ ہے۔ حسن شاہ کھویہامی خو اُس بات کے معترف ہیں کہ ان کے جد جن کا نام گنیش کول دتاتری تھا۔ کشمیر کے مایۂ ناز صوفی بزرگ جناب شیخ حمزہ مخدومؒ کے دست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور علیٰ حضرت نے انہیں شیخ غازی نام رکھا تھا۔ یعنی ان کے اولاد پھر اسلام کے نور سے منور ہوئے اور شیخ غازی کے بعد افضل اور شیخ یعقوب ان کے نسل میں سے تھے۔ شیخ محمد افضل جو مغل دَور میں کشمیر کے رئیسوں میں شمار کیا جاتا تھا کو مغل بادشاہوں نے کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اور بطور جاگیر مال و دولت اور زمین کا حصہ عطا کیا تھا۔ شیخ افضل زونی مرسرینگر میں مقیم تھے۔

شیخ فاضل اپنے عہد میں کشمیر کے بڑے شیخ تھے اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔ سکھوں کے عہد میں حسن شاہ کے خاندان کو سیاہ دن دیکھنے پڑے تھے کیونکہ ان کی جاگیر اس زمانے میں بند کی گئی تھی اور سختی کی وجہ سے انہیں پرگنہ گامرو بانڈی پورہ جانا پڑا تھا۔ جیسا کہ پیرغلام حسن شاہ نے خود اپنی تالیف ''اعجاز غریبہ'' میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

سکھوَ یلہ بند کور جاگیردار سونی
لُوگی در کھویہامہ بابہ میونی

(سکھوں نے جب ہماری جاگیر ضبط کی، تو ہمارے والد صاحب پھر کھویہامہ (بانڈی پورہ) منتقل ہوئے)
(تاریخ حسن۔ پیرغلام حسن کھویہامی۔ جلد سوم۔ ص ۳)

پیرغلام حسن شاہ کھویہامی موضوع گامرو جو قصبہ بانڈی پورہ کے قریب ہے۔ میں ایک علم دوست اور ادب پرور خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے تین اور بھائی تھے۔ ایک کا نام محی الدین تھا، دوسرے بھای کا نام غلام احمد صالح اور تیسرے بھائی صاحب کا نام تھا غلام محمد لیکن ان میں سے پیرغلام حسن ذہین ترین اور زیادہ عقلمند تھے۔ پہلے پہلے انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے عربی ارو فارسی میں درس لینا شروع کیا۔ ان کی طبیعت اور فطرت جوانی کی ابتداہی سے تحقیق اور مطالعہ کی طرف راغب تھی۔ اور کبھی کبھار اشعار بھی گنگناتے تھے۔ لیکن وہ کشمیر میں بحیثیت شاعر جانے نہیں جاتے۔ بلکہ اپنی لیاقت اور محنت کے بدولت وہ بحیثیت تاریخ دان اور تاریخ نویس نہ صرف کشمیر بلکہ کشمیر سے باہر بھی معروف و مشہور ہیں۔

غلام حسن شاہ کھویہامی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے ہی حاصل کی تھی۔ فن شعر گوئی اور انشاء نویسی میں ممتاز

تھے۔اس کے علاوہ طب میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔حسن شاہ کھویہامی نے اپنی جوانی میں کئی علاقوں کا دورہ کیا تھا اور عالموں، فاضلوں کے علاوہ وقت کے مشائخین سے بھی ملاقات کی تھی۔اس کے علاوہ سیاسی حکمرانوں سے بھی متعارف ہوئے تھے۔انہیں سفروں کے دوران حسن شاہ کی ملاقات تاشقند میں خواجہ محمد تاشقندی سے ہوئی۔جس کے اثر ورسوخ سے وہ کافی متاثر ہوئے اور انہیں کے ایماء پر وہ سلسلہ نقشبندیہ کے گرویدہ بن گئے تھے۔جس کا ثبوت انگریزی ترجمہ تاریخ حسن سے بخوبی ملتا ہے:

Pir.Ghulam Hassan Completed his early education at the feet of his father and later on acqured knowledge of TIB(Greek medicine) this amply equiped him for his ancertral professers of a religios preceptor and physician. He had a great Veneration for the family saint Mohammad Sheikh Humza who first intiated the family in the fold of Islam as the himself says in''اعجازغریبہ''

مہ اوسوم از سعادت جان تقدیر جدس میانس تمی دت تاج اسلام
جناب شیخ حمزہ چھوم پنن پیر کورن تس شیخ غازی ناو ذاکرام

(Printed in Mataba-i-Mujaddaddi Amritsar,1911-P-97)

حسن شاہ کھویہامی کو ملازمت اور تاریخ نویسی کی بدولت موقع ملا تھا۔اور کشمیر کے تقریباً تمام پرگنات کا دورہ کیا۔ وادی کے اطراف واکناف میں گھومے پھرے۔ پنجاب کے علاوہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کا بھی سفر کیا اور اسی دوران راولپنڈی پاکستان میں ملا احمد کی ''وقایع کشمیر'' انہیں ہاتھ لگی۔لیکن خود اپنے بیان کے مطابق کچھ ہی عرصے کے بعد انہیں وہ کتاب پھر کھو گئی تھی۔حسن شاہ کھویہامی کو دوسرے علاقوں کے علاوہ کشمیر کے علاقوں کو سیر کرنے کا موقع لارنس کی وجہ سے ملا تھا۔جس کو وائسرائے نے بحیثیت لینڈ سٹیل منٹ کمشنر یہاں بھیجا تھا۔نتیجتاً کشمیر کے ہر علاقے میں گئے اور زمین کا دقیق معائنہ کیا۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لارنس نے اپنی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' میں صرف دو جگہوں پر حسن شاہ کا نام لیا ہے۔اور حسن شاہ کی تعریف میں کہا ہے کہ جو کچھ میں کشمیری زبان سے متعارف ہوا وہ فقط حسن شاہ کی بدولت سے ہوا ہوں اس سے پتہ چلتا ہے کہ حسن شاہ کھویہامی کو نہ صرف کشمیری، فارسی اور اردو زبان پر دسترس حاصل تھی بلکہ عربی اور انگریزی پر بھی چیراہ دست تھے۔حسن شاہ کھویہامی نے اپنی زندگی میں ایمانداری اپنائی تھی۔اور طنزیہ انداز میں سماجی برائیوں کے خلاف اپنا قلم اٹھایا۔اس بات کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ جب ڈوگرہ دور میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں کشمیر کو خطرناک قحط سالی کا سامنا تھا تو یہاں کے حکمران ظلم وجبر کے علاوہ لاپرواہی میں مرتکب تھے۔حسن شاہ نے وزیر اعظم شری پنوں کے خلاف فارسی میں ایک شکایتی نظم لکھی اور مہاراجہ کو بھیج دی۔جس کے نتیجے میں وزیر پنون کو برطرف کیا گیا اور کشمیر کو مصیبت سے نجات دی گئی۔

پیر غلام حسن فارسی اور کشمیری زبان کا ایک بالغ نظر شاعر اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ انشاء پردازی میں بھی

با کمال تھا۔ وزیر پنون کے بعد کشمیر کا وزیر اعظم آننت رام بنا تھا۔ جس نے پیر غلام حسن کو تاریخ کشمیر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اور حسن نے لبیک کہا اور تاریخ کو مرتب کرنے میں تیس (۳۰) کتابوں کا مطالعہ کیا۔ دراصل غلام حسن کو سرزمین کشمیر سے پیار تھا اور یہاں کے لوگوں کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ لیکن اس بات کی بھی وضاحت خود ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ہوتی ہے کہ وہ روایتی انداز میں سنی سنائی کہانیوں کے برخلاف تھے۔ اور تحقیق ذہن کے مالک تھے۔ دقیق مطالعہ کرتے تھے۔ بالآخر حسن شاہ کھوہامی نے ۲۸؍ جمادی الثانی ۱۳۱۶ھ ھجری قمری مطابق ۱۸۹۸ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اور میسرہ بی بی کے مقبرے میں مدفون ہیں جو کھویہامہ گامرو میں واقع ہے۔

حسن شاہ کے آثار میں سے سب سے زیادہ اہم ''تاریخ حسن'' ہے۔ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے خانقاہ معلیٰ سرینگر کی لائبریری اور اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ صاحبزادہ حسن شاہ جو ۱۹۵۴ء کے دوران محکمہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز کے ڈائریکٹر تھے نے تاریخ حسن کی نقل کاپی باضابطہ طور پر حاصل کی اور چھاپ دی۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں محکمہ کے ڈائریکٹر شری پی این پُشپ نے تاریخ حسن کو چوتھا حصہ زیور طبع سے مزین کیا اور اس حصّے کی کتاب کا کام غلام رسول بٹ صاحب نے انجام دیا۔ اس کے علاوہ استاد محمد ابراہیم اور غلام رسول بٹ مذکور نے حصہ سوم کو بھی تدوین کی اور شائع کیا۔

مصنف نے یہ تاریخ حسن چار جلدوں میں لکھی ہے۔ پہلی جلد جغرافیہ کشمیر پر مبنی ہے۔ دوسری جلد ہے کشمیر کی سیاسی تاریخ پر تیسرا جلد کشمیر کے اولیاء کرام پر ہے اور چوتھا جلد کشمیر کے فارسی شعراء پر مشتمل ہے۔

(جلد اول): تاریخ حسن کی پہلی جلد جو کشمیر کی جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے، کو مصنف نے حمد خداوند اور نعت سرور کائناتﷺ کی مدح سرائی سے آغاز کیا ہے۔ اہل بیت اور ائمہ معصومین کی عقیدت و احترام میں بھی لب کشائی کی ہے۔

الٰہی حسؔن را بکن بعث و نشر　　　　بہ این چنین پر عیش در روز حشر

''بہ مقتضای الحاج و ابرام بعضی عظمائی نامی و جمعی از صدقای گرامی کہ دراذعان فرمان ایشان عدولی کردن عین فضولی بود و در تسیم و ترمیم این رسالہ اتفاق انتساق افتاد''

اس کے بعد مؤلف خود اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب کو جو ایک اہم اور مستند تاریخی حیثیت رکھتی ہے کو ترتیب دینے میں تیس کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ اور جن کتابون کو خاص تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نام یوں گردانے ہیں۔

''تاریخ وقائع کشمیر از ملا احمد، واقعات کشمیر از خواجہ محمد اعظم، بہارستان شاہی مشہور بہ راز ہ ترنگ، تاریخ حیدر ملک چاڈورہ، نظام الوقایع از مولوی محمد، تاریخ مولوی از امیر الدین پکھلول، لب التواریخ از مولوی بہاء الدین، باغ سلیمان از میر سعد اللہ منظوم، مختصر التواریخ از ملا عبدالنبی، تاریخ ہادی از محمد حیات و پنج مثنوی از کلیم و سلیم و کلیم و خصالی و میر الٰہی و احسن در تعریف کشمیر، گلزار کشمیر و گلاب نامہ از دیوان کرپارام منتخب التواریخ از نارا ین کول، جمع التواریخ از بیربل کاچرو، تاریخ انگریزی از مسٹر لارنس صاحب ناردرن بیریر از مسٹر درو صاحب، جغرافیہ عالم از ہنڈرسن صاحب، تاریخ فرشتہ، ناسخ التواریخ، تاریخ رشیدی، واقعات

درانی،قصص الہند، واقعات ہند،گلدستہ کشمیر، جام جہاں نما، نجیت نامہ،فرد افروز، مفتاح الارض وغیرہ‘‘

اس کے بعدان کتابوں میں موجود کمی بیشی کودور کر کے اپنی کتاب کومرتب کیا ہے۔سب سے پہلے آسمانوں اورزمینوں کی تخلیقات کے بارے میں دنیا کے مختلف قوموں اورملتوں کے خیالات ونظریات کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات کوبھی واضح کیا۔ سیاروں اورستاروں سے متعلق بھی اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔سمندروں کی وسعت اورسات اقلیم کے حدوں کوبھی جغرافیائی نقطہ و نظر سے بیان کیا ہے۔اس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں کے زمینی رقبات اورکس ملک میں کتنی ریاستیں ہیں اور کتنے لوگ ہیں کوبھی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔اس کے بعد کشمیر کے طول وعرض پرآ کر کشمیر کے موسموں، ہواؤں، پہاڑوں، سبزہ زاروں، کریوہوں (سرائیوں) باغوں، غاروں، مختلف قسم کے پتھروں، چشموں، جھیلوں، تالابوں، ادویات، غلہ جات، ثمرات، شوارع (راستوں) اورمضافات کشمیر کے بارے میں مدلل اور مفصل اطلاعات درج کی ہیں۔

اس کے علاوہ کشمیر کے قصبہ جات، پرگنات اور کشمیر کے پلوں، مسجدوں، خانقاہوں، قلعوں، مندروں، قوموں، نسلوں، مذہبوں، لباسوں اورحادثات آفاقی وزمینی پربھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ بیچ بیچ میں کہیں کہیں سیاسی واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں اورکہیں کہیں بادشاہوں کے فرمانوں کوبھی نقل کیا گیا ہے۔کشمیر کی مدح سرائی میں کشمنیر شعراء کےعلاوہ بیرون ازکشمیر کے شاعروں کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔یہ کتاب ہر کشمیری کے لیےاپنی ثقافتی وراثت کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے بہت سودمنداورکارآمد کتاب ہےاواچھی ضخیم بھی ہے۔

تاریخ حسن کی دوسری جلد کشمیر کی سیاسی تاریخ پرمشتمل ہے۔اس میں مؤلف نے کشمیر کے ابتدائی سیاسی حالات سے لیکر۱۸۸۵ھ تک کے حالات بیان کئے ہیں۔کتاب کومولف نے تاریخی لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔آغاز میں مقدمہ لکھا ہےجس میں اسلامی اورغیر اسلامی نقطہ ونظرات کوپیش کیا گیا ہےاور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذاہب کا آغاز، دنیا کا آغازاور سیاسی حکومتوں کا آغاز کب اورکیسے ہوا۔چنداحادیث کے علاوہ آیات قرآنی کا ترجمہ اوراقوال اکابران کا بھی سہارالیا گیا ہے۔اس کتاب کومولف نے پندرہ اورنگوں میں منقسم کر کے حکمرانوں کے حالات اوران کے جنگوں کا حال بیان کیا ہے۔اورنگ اول راجہ آرگونند سے شروع ہوتا ہےاورہال گونند پر چار پادشاہوں کی ذکر سے پائیہ تکمیل کوپہنچتا ہےاورنگ دوم پانڈوؤں کے بارے میں ہےاورراجہ ہرن دیو سے شروع ہوکرراسندرسین پر پایہ تکمیل کوپہنچتا ہےاورنگ سوم راجہ لوؔ سے لیکرراجہ ابھومینوؔ تک، اورنگ چہارم راجہ گونند سومؔ سے لیکرراجہ آری راجؔ تک اورنگ پنجم راجہ میگواہن سے لیکرراجہ بالا دتؔ، اورنگ ششم کارکوٹ بنسی کے راجاؤں کی ذکر میں ہےاورراجہ درلب درونؔ سے لیکرراجہ وت پلاپیڈ تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ساتواں اورنگ خماررراجاؤں کے بارے میں ہےاوراراجہ اونتی ورمنؔ سے شروع ہوکرراجہ شیرورماؔ پرختم ہوتا ہے۔آٹھواں اورنگ رایشکرؔ سے لیکردیدارانیؔ،نواں اورنگ سنگرام راجؔ سے لیکرسہ دیوتک، دسواں اورنگ رینچنؔ سے شروع ہوکرسلطان حبیب شاہؔ کے عہد تک بادشاہوں کے احوال درج کئے ہیں۔ اس اورنگ میں اسلامی خیالات اورعقاید کاکشمیر میں پھیلنا اورمیر سید علی ہمدانیؒ کے کشمیر آنے کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔گیرھویں اورنگ چکوں کی حکومت سے متعلق ہےاورغازی خانؔ سے لیکرجلال الدین محمداکبرشاہ کے حالات پرمشتمل ہے۔چغتائیہ حکمرانوں کے

بارے میں مفصل اطلاع بارھویں اورنگ میں ہے جو جلال الدین اکبر سے لیکر ابوالقاسم خان اور احمد شاہ درانی کے خراسان اور ہندوستان کے علاوہ کشمیر پر تسلط پانے تک کے حالات پر مشتمل ہے پھر احمد شاہ درانی سے لیکر سردار جبار خان تک کے حالات تیرھویں اورنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ چودھوان اورنگ سکھوں کی حکومت سے شروع ہوتا ہے اور ہری سنگھ سے لیکر مہاراجہ گلاب سنگھ تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پندرواں اورنگ گلاب سنگھ کے حکومت کے بعد کے حصے پر مشتمل ہے۔ جس کو مولف نے گلاب سنگھ اور دیگر سکھوں کے وزیروں کے حالات وغیرہ پر ترتیب دیا ہے۔ خاتمہ منظوم ہے۔

کتاب کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کتاب کو ترتیب دینے میں مولف نے کشمیر کی کئی تواریخ کا مطالعہ کیا ہے جن میں الاکلیل، ناسخ التواریخ معیار الاخبار، وقایع کشمیر، رتنا کر پران، ترجمۂ راجہ ہای تواریخ کشمیر خاص طور پر اہم تصور کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کو مولف نے ۱۳۰۲ھ بمطابق ۱۸۸۵ء میں پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے اور اختتامیہ میں یوں لکھا ہے۔

پی سا اتمامش ای نیک خو خرد گفت 'تاریخ کامل' بگو
پی نزہت خاطر دوستان نہادم من این ارمغان درجہان
اگر فرصتم باشد از چرخ دون نگارش کنم جلد ثالث کنون

اس کتاب کا طرز نگارش سہل، آسان اور روان ہے۔ کہیں کہیں فصیح و بلیغ انداز کے علاوہ مقفع و مسجع طرز میں رقمطرازی کی ہے۔ اہم نکتہ ی ہے کہ کئی جگہوں پر تحقیقی انداز کو اختیار کیا ہے اور حقیقت کو سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخ حسن کا تیسرا حصہ جو تذکرہ اولیای کشمیر کے نام سے مشہور ہے اور اسرارالاخیار کے نام سے موسوم ہے ۱۳۰۵ھ میں مکمل ہو چکا ہے۔

دل گفت بجان اختتامش 'اسرارالاخیار' سال وناس

اس جلد کو بھی حسن کھویہامی نے حمد خداوند سے شروع کیا ہے اور ابتداء میں بطور تمہید اولیاؤں کی صحبت میں رہنے کی فضیلت اور حقیقت کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور چند اشعار مثنوی سے نقل کئے ہیں۔

اولیا را ہست قدرت از الا تیر جستہ باز گرداند زراہ
نایب است ودست او دست خداست یک زمانی صحبتی بااولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بی ریا گر تو سنگ خارہ و مرمر بدی

اولیای کشمیر میں سے سب سے پہلے سید شرف الدین ملقب بہ بلبل شاہؒ کا ذکر کیا ہے اور ان کے احوال کو پوری مناسبت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسکے بعد دوسرے صوفی بزرگوں کا حال بیان کیا ہے۔ میر سید علی ہمدانی معروف علی ثانی کی خدمات کو بھی یاد کیا گیا ہے اور ان کی ابتدائی زندگی کے احوال کو بھی کرامتی پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد سادات، فضلاء اور ریشیان کشمیر کے احوال بیان کئے ہیں اور پوری کتاب کو پانچ خمیس میں بیان کیا ہے۔ خمیس اول میں سادات عالی درجات کا ذکر ہے۔ اس خمیس میں دو

سوانیس سید سادات کے احوال مندرجہ ہیں۔خمیس دوم کشمیر کے ریشیوں سے متعلق ہے۔اسکو دو طبقوں میں منقسم کیا گیا ہے۔طبقہ اول میں حضرت اویس قرنیؓ سے سوزن ریشیؒ تک نور یشیوں کے حالات درج کئے ہیں۔ابتداء میں شیخ نورالدین ولیؒ کے حالات وکوائف درج کئے گئے ہیں۔خمیس سوم مشائخ اور صلحای ربانی کے حالات میں ہے۔سب سے پہلے شیخ بہاءالدین گنج بخشؒ کے حالات تفصیلاً بیان کئے ہیں۔اس کے بعد سات سو اٹھاون صوفی بزرگوں کے احوال وکرامات درج ہیں۔کل ملا کر ایک سو چوبیس عالموں او رفاضلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔خمیس پنجم میں مجذوب اولیاؤں کے حالات اور کوائف بیان کئے ہیں۔سب سے پہلے مجذوب بی بی لل عارفہ کے حالات تفصیل مع کرامات بیان کئے گئے ہیں۔کل باسٹھ مجذوب سالکوں کا حال مفصلاً بیان کیا ہے۔اسکے بعد خاتمہ لکھا گیا ہے جس میں کشمیر میں موجود اشیای متبرکہ اور اوزار محترمہ کی حقیقت مع تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جوتبرکات جناب رسالت مآب ﷺ سے اس دیار میں پہنچے اور حضرت بل کے علاوہ، کلاش پورہ، اندروارہ صورہ اور ڈانگر پورہ میں موجود ہیں کی تاریخ آورد بھی لکھی ہے۔اس کے بعد متفرقہ تبرکات جو خانقاہ معلیٰ، نروارہ زین علی ڈار، نرپستان، خانیار، عالی کدل اور خواجہ معین الدین نقشبندیؒ کے آستان میں، شاہ نیاز نقشبندی اور اسلام آباد میں موجود ہیں کے بارے میں بھی مفصل جانکاری پیش کی ہے۔کل ملا کر بارہ سواسّی اولیاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔زبان سادہ، روان مگر کہیں کہیں مقفع اور مسجع عبادت پیش کی گئی ہے۔کہیں کہیں اقوال اور اشعار بیان کئے گئے ہیں اور عارفوں کی تاریخ وفات بھی اکثر لکھی گئی ہے اور حروف ابجد کے مطابق تاریخ نکالی گئی ہے۔

حسن شاہ کھویہامی نے تاریخ حسن کا چوتھا حصہ یعنی تذکرہ شعراء کشمیر کے فارسی شاعروں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس نسخے میں ایک سو اٹھارہ شاعروں کا ذکر مع نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے۔جلد کی ابتداء قلم کی مدح سرائی سے کی گئی ہے۔قلم سے گذارش کی گئی ہے کہ اے قلم تم نے فقراء کا حصہ مکمل کیا اور اب شاعروں کا حصہ شروع کردے۔شاعروں کی موزوں طبیعت کی بھی مدح سرائی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ شاعر شعر کو خدا کے نور اور ہدایت سے تخلیق کرتا ہے اگر دنیا میں سخنوری کا فن نہیں ہوتا تو چھپے رازوں کو عیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس کے علاوہ نفس کو شہوانی خصائص کا دلدادہ اور سخندانی کے روح کو فرحت پہچانے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔اس نسخہ کا آغاز شاعر میر علی سے کیا گیا ہے جو حسین شاہ چک کے زمانے میں کشمیر آیا اور یہیں مدفون ہوا تھا۔تاریخی لحاظ سے شاعروں کا انتخاب کیا گیا ہے اور حاجی مختار شاہ اشائی کا ذکر آخری شاعر کے بطور نسخے کا اختتام کیا ہے۔اس کے علاوہ مولف خود یہ کہتا ہے کہ میں نے عروض، قوافی، بحور، ترصیح، تلمیح کا علم نہیں پڑھا بلکہ یہ سب دلچسپی کا ثمرہ ہے اور خدا کی رضامندی بھی اسی میں ہے ۔

بحکم ازل ہر کس سر نہاد ازل را نظر بردلم اوفتاد
بہ ترتیب این نامہ پرداختم گرامی گہر ہاتبہ ساکتم

مؤلف نے یہ بھی لکھا ہے کہ زمانے کے لوگوں نے مجھے اس کتاب کو تصنیف کرنے میں کوئی تحسین وقدر دانی نہیں کی ہے بلکہ طعنہ زنی اور نفرتوں کے لیے اپنے منہ کھولے ہیں اور میرے کام کو افراط وتفریط تصور کیا ہے۔لیکن میں نے محنت کی اور اس شمع کو روشن رکھا۔

زاقران خود شرم وارم بسی کہ مطعون ساز مرا ہر کسی

نسازد کسی وقر وتحسین من گشایند لب ہاب نفرین من
یکی بہر افراط تہمت کند دیگر بہر تفریط شنعت کند
اگر عاقلان عیب پوشی کنند مگر جاہلان کی خموشی کنند

اس کے علاوہ اپنے اس کام کا انجام چونکہ خود نہیں جانتا ہے اس لیے اللہ سے خواستگار ہے کہ مغفرت کی جائے۔

خدایا ز رحمت مگردان ملول بحق ہم اہل بیت رسولؐ

اس کتاب کو تالیف کرنے کے دوران حسن کھویہامی نے مختصراً شاعروں کے حالات بیان کئے ہیں۔ حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ لفظوں کی تکرار نہ ہو اور اکثر جگہون پر مترادف الفاظ استعمال کئے ہیں اور کشمیری الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ چونکہ حسن شاہ کھویہامی خود ایک شاعر تھے۔ کئی جگہوں پر مقفع اور مسجع نثر لکھی گئی ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہو:

''چون لالہ با جام مدام بزم آرای اہل کرام وشوق افزای ارباب نام''

''چوں جان محمد قدسی را اکبر شاہ بز رسنجید و وی نہایت رنجید وبغیر برخود پیچید''

''دیوان طبع زادش مشہور وابیات از نتائج افکارش مسطور''

''مردی آراستہ واز انواع فنون پیراستہ و در بدہیہ گوئی فرد نو خاستہ''

اس کتاب کا سبک کافی سہل، آسان اور سادہ ہے۔ فارسی سے بلند شاگردان کی تصانیف سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ حسن شاہ سادہ، روان اور فصیح عبارت لکھنے پر قادر ہیں۔

☆☆☆

محمد لطیف
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دربار ہمایوں میں جوہر آفتابچی کی خدمات

مغلیہ دور ہندوستان میں فارسی زبان کی ترویج وترقی کا سنہرا دور مانا جاتا ہے۔ فارسی زبان کا آبِ جو ایران کی سرزمین سے پھوٹا جس نے پورے ہندوستان کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بیشمار ادیبوں، شاعروں، مفکروں، مدبروں اور دانشوروں نے اس عمدہ اور شیریں زبان کو اپنے بیان کا وسیلہ بنایا، جس سے انتہا درجہ کی ترقی ہوی اور بڑی تعداد میں تصنیفات وتالیفات فارسی زبان میں منظر عام پر آئیں۔ اس ادبی محفل کو روشن کرنے کے لیے بابر و ہمایوں کا زمانہ نہایت ہی اہم تھا، متعدد علماء، فضلاء اور شعراء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ جنہوں نے فارسی زبان وادب کی آبیاری کرنے میں بے انتہا محنت ومشقت کر کے اس غنی زبان کو بلندیوں تک پہنچایا۔ جیسا کے ہم جانتے ہیں کہ سرزمین ہند نے بے شمار علماء فضلاء حکماء و دانشوروں کو جنم دیا۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوے ایسے کارنامے انجام دے جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جوہر آفتابچی جو ہمایوں کے دربار کا ادنی سا غلام تھا جس نے اپنے آقا کا تذکرہ لکھ کر تاریخ میں اپنا نام روشن کر دیا۔

جوہر تذکرۃ الواقعات کا مؤلف اور مغل شہنشاہ نصیرالدین محمد ہمایوں کا خادم تھا۔ اکثر و بیشتر ہر موقع ومحل ہمایوں کے ہمرقاب رہتا تھا۔ جس نے ایک بہترین آدم شناس کی طرح بغیر کسی آزکے اپنی آزاد طبع کے مطابق ہمایوں بادشاہ کے حالات کو قلمبند کیا۔ جوہر کوئی بڑا عالم وفاضل شخص نہ تھا اور نہ ہی خود اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کوئی تفصیل دی ہے۔ تذکرۃ الواقعات اس کا اہم کارنامہ ہے جس کی بدولت اس کا نام تاریخ کے اوراق میں مرقوم ہے۔ جوہر دربار ہمایوں میں ایک غیر معمولی خدمت پر مامور تھا۔ باوجود اس کے جوہر کو ہمایوں بادشاہ کا قرب خاص حاصل تھا اور بادشاہ بھی جوہر کو اپنا عزیز سمجھتا اور اس کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتا تھا۔ اپنی تصنیف تذکرۃ الواقعات میں جوہر نے اپنی خدمتگاری اور قرب خاص کا ذکر کیا ہے۔ جس کو ایلیٹ اینڈ ڈاوسن نے اپنی کتاب (ہسٹری آف انڈیا) میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

jauhar says, "I was at all time and in all station in constant attendance on the royal persion.....i shoukd write a narrative of all the events to which i had been an eye-witness that it may remain as arecord of the part intresting occurences"[1]

سید صباح الدین عبدالرحمن اپنی کتاب بزم تیموریہ میں جوہر کی خدمات سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''ہمایوں کا آفتابچی تھا، خلوت وجلوت میں برابر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے ہیبت پور کا محاصل اور پھر سرکار پنجاب و ملتان کا خزانچی بھی مقرر ہوا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۹۵ ہجری میں تذکرۃ الواقعات لکھنا شروع کی، جس سے ہمایونی عہد کے بعض سیاسی واقعات کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں۔''[۲]

محمد عبدالغنی اپنی کتاب *HISTORY OF PERSIAN LANGUAGE ANDLITERATURE AT THE MUGHAL COURT* میں جوہر کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

"He entered Humayun service as an ewer-bearer at a very young age and attended him faithfully during his service and flight fron hundustan."[3]

تذکرۃ الواقعات کے مصنف نے اپنی زندگی کا آغاز شاہی اصطبل خانہ سے کیا، بعد میں غاشیہ بردار کی حثیت سے ایک مدت تک ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں مشغول رہا۔تذکرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ادنیٰ سی خدمت کی بدولت جوہر کو پرگنہ ہیبت پور کا محاصل بھی مقرر کیا گیا، جہاں مزید ترقی کر کے پنجاب و ملتان کا صوبیدار بھی تعینات ہوا۔ایلیٹ اینڈ ڈاوسن نے جوہر کی ترقی کے متعلق اطلاعات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے

"When Humayun recovered Lohar, he immediately divided the appointment of the province among his adherents,and Jauhar was appointed collector of the village of Haibtpur."[4]

جوہر نے خود بھی اپنی تصنیف تذکرۃ الواقعات میں آپنے عہدے سے متعلق اطلاعات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''چون بادشاہ درلاہور اقبال رسیدندو قرار یافت کہ پرگنات گردو نواخی را برای تحصیل خدمتگاران تعین باید کرد فقیر جوہر را برای پرگنہ ہیبت پور بینی نامزد ساختند.''[۵]

ہمایوں اور آخری دو بادشاہوں کو چھوڑ کر مغل حکمرانوں کی تاریخ کسی نہ کسی معتبر مورخ کے ہاتھوں ضرور لکھی گئی، مورخین کی یہ جماعت تاریخ نویسی سے دلچسپی رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں چند دیگر مورخوں نے اپنے آقا کی دادو دہش سے متاثر ہو کر ان کے زیر سایہ اپنی تصانیف کو مکمل بھی کیا۔ بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے حالات و واقعات تو بے شمار مورخوں نے اپنے اپنے انداز میں تحریر کیے ہیں، لیکن ہمایوں کے حالات کسے معتبر مورخ کے ہاتھوں نہیں لکھے گئے۔گلبدن بیگم نے اگرچہ ہمایوں نامہ لکھ کر کسی حد تک اس کمی کو پورا کرنے کی سعی کی ہے، مگر پھر بھی ہم کو دیگر حکمرانوں کی طرح ہمایوں کے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ جوہر آفتابچی نے بھی بڑی محنت ولگن کے ساتھ ہمایوں کے عہد سے متعلق واقعات بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، جس سے ہمایوں کی شخصیات کے کئی پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔

مغلیہ دور میں اگرچہ علوم وفنون کی بے شمار شاہرائیں ہر خاص وعام کے لیے کھلی ہوئیں تھیں، بالخصوص تاریخ نگاری پر اس دور میں بے شمار کام بھی ہوا۔ چونکہ اس دور میں اکثر بادشاہ وامراء علوم وفنون کی سرپرستی اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ یہ بادشاہ وامراء خود بھی اس فن سے دلچسپی رکھتے تھے، جبکہ بعض صاحب تصنیف تھے۔ بابر اور جہانگیر کی تزکیں اس دور کی تاریخ کا بہترین مآخذ ہیں۔اس کے علاوہ رقعات عالمگیر جو کئی ہزار کی تعداد میں موجود ہیں، مغلیہ دور کی تاریخ کا بہترین سرمایہ ہیں۔ابوالفضل کی آئین اکبری واکبر نامہ بھی اس دور کی بہترین تواریخ میں شمار ہوتی ہیں۔اس کے برعکس ہمایوں کے عہد میں اس کے زیر سایہ کوئی بھی مستند تاریخ نہیں لکھی گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمایوں کی زندگی کا اکثر حصہ سفر وحضر اور کس مپرسی کے عالم میں گذرا، جس کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ جتنا مواد ہم کو دیگر حکمرانوں کے عہد سے متعلق ملتا ہے، ہمایوں کے عہد سے متعلق نہیں ملتا۔ اگرچہ اس دور میں گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ ایک خاص مقصد کے لیے لکھا گیا تھا جس میں بعض مسائل پر بڑی تفصیل طلب معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کو بھی ہمایوں کی مکمل تاریخ کہنا قیاس سے خالی نہیں ہے، ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جوہر کی تاریخ ہمایوں کے واقعات بیان کرنے کے لئے ایک عظیم کارنامہ ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر جوہر ہمایوں کا یہ تذکرہ نہ لکھتا تو ہم کو عہد ہمایوں سے متعلق مکمل جانکاری نہ مل سکتی، بڑی جدوجہد کر کہ جوہر نے ہمایوں کے حالات سے ہم کو آگاہ کیا ہے۔اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ عہد اکبری میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کتابوں کو ہم صرف ہمعصر مآخذ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تصنیف کم وبیش نصف صدی کے بعد ہوئی۔ جوہر نے اگرچہ ہمایوں کی

طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرنے کے غالباً تیس سال کے بعد اس تاریخ کو لکھنا شروع کیا، مگر جوہر نے چشم دید واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کی سعی کی ہے جس سے اس تاریخ کو باقی ہمعصر تواریخ پر فوقیت حاصل ہے۔

جوہر کو اگر چہ ہندو پاک اور دیگر ممالک کی تاریخ سے کافی حد تک واقفیت نہ تھی، لیکن تذکرے کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جوہر کو سخن سنجی اور شعر فہمی کا ذوق تھا۔ اگر چہ وہ پڑھا لکھا عالم و فاضل نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے تذکرے کو ترتیب دیتے وقت جگہ جگہ قرآن کی آیات کے علاوہ خواجہ حافظ، شیخ سعدی، نظامی اور فردوسی جیسے باکمال شعراء کے اشعار نقل کیے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات اور فارسی اشعار وہی شخص نقل کر سکتا ہے جس کو سمجھنے کی مکمل سوجھ بوجھ ہو۔ جوہر اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ جب میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ احتراماً اپنے آقا کے حالات کو تحریر میں لاوں تو میں نے دیوان حافظ سے فال نکالی۔

مطرب عشق عجب ساز و نوای دارد — نقش هر پرده که زد راه بجای دارد
که خوش آهنگ و فرح بخش نوای دارد — پیر دردی کش ماگرچه ندارد زروزور
از عدالت نه بود دور گرش پرسد حال — بادشاهے که به همسایه گدائے دارد
محترم دار دلم کایں مگس قند پرست — تا هواخواه تو شد فرهای دارد
اشک خونین به طبیبان به نمودم گفتند — درد عشقست جگر سوز دوائے دارد
ستم از غمزه میاموز که در مذهب عشق — هر عمل اجرے وهر کرده جزائے دارد
نغز گفت آن بت ترسا پسر باده فروش — شادی روی کسے جو که صفائے دارد
خسروا حافظ درگاه نشیں فاتحه خواند — وززبان تو تمنائے دعائے دارد[۶]

جوہر کی اس تاریخ سے ہم کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جب ہمایوں ہندوستان سے دشمنوں اور بھائیوں کی غداری سے تنگ آ کر کس مپرسی کہ عالم میں ایران گیا تو شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کی آؤ بھگت میں کوئی قصر باقی نہیں چھوڑی۔ دوسرے یہ کہ پھر اس کو مذہب اثنا عشریہ اختیار کرنے کی دعوت بھی دی۔ اگر جوہر اس بات کو اپنے تذکرے میں نہ لکھتا تو شاید ہمیں اس بات سے درگذر کرنا پڑتا، جوہر کے علاوہ کسی بھی مورخ نے اس بات کو بیان نہیں کیا۔ جوہر آپنے تذکرے میں اسطرح لکھتے ہیں؛

''بعد از آں قاضی جہان سہ قطعہ کاغذ نوشتہ حضرت شاہ عالم پناہ طہماسپ صفوی آورد دو قطعہ را بہ حضرت محمد ہمایوں بادشاہ گذارند حضرت بادشاہ بعد از مطالعہ خود برخواست بکنار خرگاہ آمد بآواز بلند لعن طعن بر دشمنان رسالت و امامت وولایت فاش گفتن آغاز کرد آنگاہ سیومیکا غذ را حضرت شاہ عالم پناہ خود رجوع کردہ بدست حضرت دادایشان در حضور شاہ عالم پناہ خواندند و مذہب بر حق امامیہ اثنا عشریہ اختیار کردند.''[۷]

جوہر مورخ باوقار تو نہ تھا لیکن اس نے تعصب کی عینک اتار کر اپنی قوت علمی کہ مطابق ہمایوں کہ واقعات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اگر چہ ایک طرف اپنے تذکرے میں ہمایوں بادشاہ کی شجاعت و مردانگی کی تعریف کی ہے تو دوسری جانب اس کی جلاوطنی اور کس مپرسی کہ حالات بھی بیان کیے ہیں۔ جوہر کا بیان ہے کہ طہماسپ صفوی کسی بات پر ہمایوں سے دلبرداشتہ ہو گیا تو طہماسپ کی ہمشیرہ نے ہمایوں کی ایک رباعی پڑھ کر شاہ صفوی کو سنائی جس سے اس کا غبار خاطر جاتا رہا۔

هستیم زجان بندہ اولاد علی — هستیم همیشه شاد باباد علی
چون ولایت زعلی ظاهر شد — کردیم همیشه دردخود نادعلی

مغلیہ حکومت کے بنیان گذار ظہیر الدین محمد بابر کی طرح اس کا فرزند رشید نصیر الدین محمد ہمایوں بھی صاحب علم تھا۔ اگر چہ علم و ادب کے میدان میں بابر کی طرح اس نے کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا، لیکن پھر بھی فرصت کے اوقات میں اس نے شعر و سخن کا

مشغلہ جاری رکھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر ماہر علم ریاضی، نجوم، طب اور ہیت تھا۔ اس کے علمی وادبی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ غریب الوطنی کے عالم میں بھی ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہمیشہ اس کہ ساتھ رہتا اور فرصت کہ اوقات میں ہر وقت مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے دربار میں شعر وسخن اور علمی بحث ومباحثہ جاری رہتا۔ شہنشاہ مغل نہ صرف اہل علم اور صاحب قلم تھے بلکہ وہ اپنے دربار کہ علماء، فضلاء اور ادباء کی سرپرستی بھی کرتے تھے جس کی بدولت دربار مغلیہ نہ صرف بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں، مفکروں اور مدبروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا بلکہ علم وادب کے شیدائیوں نے فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی میں اہم کارنامے انجام دے۔

تذکرہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد ہمایوں کی مکمل تاریخ لکھنا نہیں تھا بلکہ صرف ان واقعات اور مہم جوئیوں کا ذکر کرنا مقصود تھا۔ جس میں وہ ہمایوں کے ساتھ رہا۔ اس نے اپنی خدمات کو ہمایوں کی تخت نشینی سے لے کر دوبارہ ہند پر قابض ہونے تک محدود رکھا ہے۔

جوہر کا بیان ہے کہ ہمایوں نے ہمیشہ سچائی، سادگی اور نیک نیتی کا درس دیا۔ کیونکہ عناد پرستی اور عداوت اس کے ضمیر میں قدرے کم تھی۔ اس کی بہ نسبت فریادرسی میں اس کو ملکہ حاصل تھا۔ عصبیت داری میں حکومت کو لے کر کبھی بھی اس نے جھگڑا نہ ہونے دیا، بلکہ اپنی زیست کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ اگرچہ کئی بار بھائیوں کی غداری اور بے راہ روی کی وجہ سے اس کو ذلیل اور رسوا ہونا پڑا، لیکن پھر بھی اس کی کرم نوازی اور رحم دلی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اپنے بھائیوں کے تئیں اس نے اپنے خلوص کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی سچائی اور فراق دلی کی بدولت ہمایوں ایک بار معزول ہونے کے بعد دوبار ہندوستان جیسے عظیم ملک کا بادشاہ بن گیا۔ جوہر نے ان الفاظ میں ہمایوں کی نیک نیتی اور آزاد طبع کی تعریف کی ہے۔

''این سخن محال است کہ بعد معزول شدن بادشاہ باردیگر ملک بدست آید۔ مگر بہ نیت نیک خود پس چون این آرزو وخیال دردل این بندہ قرار یافت، از ابتدای خلافت تا انتہا کہ حضرت بادشاہ باردویم ملک رابدست آوردند''۸

جوہر نے تذکرۃ الواقعات کو ترتیب دیتے وقت سادہ اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ تذکرۃ الواقعات کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں اس دور میں لکھی گیئں جن میں واقعات کی تفصیل بھی ہے، لیکن جوہر کی اس کوشش نے اس کو عہد مغلیہ کے بہترین قلمکاروں میں شامل کر دیا۔

مختصر یہ کہ جوہر نے اپنی اس تاریخ کو کسی مخصوص زاویہ فکر کے لئے ضبط تحریر میں نہیں لایا بلکہ اس کا مقصد ہمایوں کے عہد کی شان وشوکت، اس کی شجاعت ومردانگی، ہمہ تن فیاضی اور رحم دلی کی داستان کو بیان کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جوہر کی اس تاریخ کو اس دور کی دیگر تواریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ جس نے علم وادب کے دسترخوان پر بڑی لذیز چیز رکھ کر ارباب علم وفن کے لئے بڑی لذت کا سامان مہیا کر دیا۔

حواشی۔

۱۔ The History of india,Elliot and Dowson,vol,v,p,136,37

۲۔ بزم تیموریہ، ج، ۱، ص، ۸۶، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۳۔ History of persian language and literature at the Mughal court, by Muhammad Abdul Ghani part 2, p.100,Allahabad,1930 A.D

۴۔ The History of india,Elliot and Dowson vol,v, p, 138

۵۔ تذکرۃ الواقعات مولف جوہر آفتابچی، مخطوطہ حبیب گنج کلکشن کتابخانہ آزاد دانشگاہ اسلامی علیگر، ص، ۷۷

۶۔ ایضاً، ص، ۸

۷۔ ایضاً، ص، ۴۱

۸۔ ایضاً، ص، ۳

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین
گیسٹ لکچرر، شعبہ عربی وفارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

علامہ آزاد بلگرامی کی تذکرہ نگاری

اٹھارہویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) مغلیہ کا عہد اور دور رہا ہے جس میں بیشمار علماء، فضلاء، اور مؤرخین پیدا ہوئے۔ اسی عہد کے ایک نامور محدث، مؤرخ، ادیب اور شاعر علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جن کی ادبی تحریریں ہر زمانہ میں مؤلفین، مؤرخین، ادباء اور شعراء کے مصادر و ماخذ رہی ہیں۔ مقبول احمد صمدنی حیات جلیل میں لکھتے ہیں:

''بارہویں صدی کے لئے ہندوستان میں آزاد کی ذات ایک نعمت بے مثال تھی، وہ مجسمہ ذہانت وقابلیت تھے، اپنی لا زوال یادگار میں عربی وفارسی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے'' (حیات جلیل، ۲:۱۷۲)

علامہ آزاد بلگرامی ضلع ہردوئی کے قصبہ بلگرام میں ۲۵ رصفر المظفر ۱۱۱۶ھ کو جلوہ افروز ہوئے۔ علامہ موصوف کا ددھیالی اور ننہالی دونوں اعتبار سے نہایت مہذب اور اعلی تعلیمیافتہ خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت علم وفضل کی گود میں ہوئی اور انھوں نے علم وعمل اور صلاح وتقویٰ کے پاکیزہ ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں چنانچہ انہیں ننیہال اور ددیہال دونوں ہی جگہ قابل فخر اساتذہ اور مربیوں سے استفادہ کرنے کا بھرپور موقع میسر ہوا، علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی، جو کہ آپ کے نانا حضور ہی تھے ان کے علاوہ محبّ اللہ بہاری، ملا نظام الدین، شیخ علی حزیں، خان آرزو وغیرہ جیسے فاضل علماء، ادباء موجود تھے جن کی صحبتوں اور علمی مذاکروں کے دوران علامہ موصوف کے فضل وکمال، عقل وفہم، عادات واطوار اور اخلاق کے جوہر منظر عام ہوئے۔

علامہ موصوف چونکہ بچپن ہی سے درویش مزاج انسان تھے اس لئے بالکل عین جوانی کے وقت جبکہ وہ علم ظاہری کے حصول میں مشغول تھے باطن کے گنجینہ علم ومعرفت کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے وقت کے شیخ کامل سلسلۂ چشتیہ کے مرشد میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی سے ۱۱۳۷ھ میں باقاعدہ اصلاح کا تعلق قائم فرمایا اور مرشد کامل سے خلعۂ اجازت وخلافت سے ہمکنار ہوئے۔

علامہ آزاد بلگرامی کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے صغرسن ہی سے والہانہ عشق تھا اسی جذبۂ عشق نے آپ کو ''ہندوستان کا حضرت حسان بن ثابت'' بنادیا۔ ۱۱۵۱ھ میں موصوف کو حرمین شریفین کی زیارت اور حج کی سعادت حاصل ہوئی، زیارت حرمین شریفین کا جذبہ دل میں اس قدر موجزن تھا کہ علامہ موصوف نے قصبہ بلگرام سے ''سرونج'' تک جو مالوہ کے حدود میں واقع ہے پاپیادہ سفر کیا، رفیق سفر محض تنہائی تھی، صبح سے شام تک چلنے کی وجہ سے پاؤں خون آلود ہوگئے، اپنی اس حالت کو علامہ نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''آبلہائے پا را خوشۂ تاک ساخت خار ہا طرح خانہ زنبور انداخت'' ناہموار جنگلات اور خوف ودہشت کا منظر تھا لیکن قلب میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جذبہ تھا جو ان کو چلائے بلکہ دوڑائے جارہا تھا۔ انھوں نے اپنے اس سفر کا ذکر بہت ہی والہانہ اور ادیبانہ انداز میں اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''مآثر الکرام'' میں بیان فرمایا ہے۔ اپنے قلب کی اس آواز کو وہ شعری جامہ پہناتے ہوئے زمزمہ سنج ہیں۔

صبح تا شام راہ می رفتم　　خوں چکان تر زآہ می رفتم

ہمہ کہسار و دشت و ناہموار قدم موردایں راہ دشوار

علامہ آزاد بلگرامی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ خواہ وہ حدیث کی شرح ہو یا فقہ کا کوئی مسئلہ اور خواہ وہ تذکرہ نگاری ہو یا پھر تنقید نگاری، جب وہ حدیث میں مسائل شریعت کی تشریح کرتے ہوتے ہیں تو ان کی زبان پر محدث عصر اور فقیہ وقت کی زمزمہ سنجیاں ہوتیں ہیں اور جب وہ کسی چیز کی تاریخی حیثیت سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابن بطوطہ ان کا ہمراہی ہے، اور جب وہ مسند شعر و شاعری پر جلوہ فگن ہوتے ہیں تو امرؤالقیس اور نابغہ کی جھلک نظر آتی ہے، اور جب نقد و تنقید پر قلم اٹھاتے ہیں تو عربی ادب اور دور عباسی کا معروف شاعر و عظیم ادیب ''ابوالطیب المتنبی'' بھی اس کے دامِ تنقید میں آجاتا ہے۔

اور جب بات کی جائے آزاد بلگرامی کی تذکرہ نگاری کی تو اس راہ میں ایسا طرز اختیار کیا جس نے ان کو صاحب تاریخ نظامی، صاحب منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی اور علامہ ابوالفضل وغیرہم سے ممتاز کر دیا، اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان مؤرخین نے اپنے اپنے عہد کے امراء، علماء، فضلاء اور مشاہیر کے حالات اپنی کتابوں میں بطور ضمیمہ کے رقم کیا اس کے برعکس آزاد بلگرامی نے اسے الگ سے ایک ''فن'' کی حیثیت سے عوام کو روشناس کرایا۔

''فن تذکرہ نگاری'' ''تاریخ'' کی ہی ایک شاخ ہے جس کو عربی میں ''اسماء الرجال'' کہا جاتا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کو اس بات پر فخر ہے کہ ہندوستان میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس فن پر قلم اٹھایا، علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے علماء اور ارباب عمائم کے حالات قلمبند کئے، آزاد نے اس او لیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے''۔ (مقالات شبلی، جلد ۵: ۱۱۸)

علامہ آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں تحریر کرتے ہیں:

''وما رأينا من السلف والخلف كتابا مستقلا في هذا الباب ، لا على طريق الايجاز و لا على سبيل الاطناب'' (سبحۃ المرجان: ۶۲)

علامہ بلگرامی کی اکثر تصنیفات اسی فن پر ہیں۔ دراصل جب مغلیہ سلطنت اپنا وقار باقی نہ رکھ سکی اور وہ رو بہ زوال ہونے لگی تو اس کے انحطاط کے ساتھ ہی فن تاریخ نویسی جو بقول علامہ شبلی نعمانی:

''فن رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے''۔ (مقالات شبلی، جلد ۵: ۱۱۸)

اس پر بھی انحطاط اور زوال کا اثر شروع ہو گیا۔ علامہ آزاد نے اس کی طرف توجہ کی اور اس فن کو زندۂ جاوید بنا دیا، علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتداء سے اس زمانہ تک کسی نے ایک کتاب بھی اس فن میں نہ لکھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سینکڑوں ہزاروں علماء و فضلاء کے حالات پر آج گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے علماء اور ارباب عمائم کے حالات قلمبند کئے'' (مقالات شبلی، جلد ۵: ۱۱۸)

علامہ بلگرامی نے تذکرے میں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' عربی زبان میں ہے، اس کتاب میں ہندوستان کی تاریخ اور اس کی خصوصیات اور فضائل نیز علماء و فضلاء کا تذکرہ ہے۔

''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' کو آپ کی جملہ تصانیف میں قدرے امتیاز حاصل ہے، اس کتاب کے نام سے ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہندوستان اور یہاں کے علماء اور ادباء کے حالات کے بیان میں ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ علمائے ہند کے

تذکرے ہی ہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف علوم وفنون پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے خاص طور سے علم بدیع کے بعض ایسے اقسام کا ذکر ہے جو ہندوستانی زبان میں موجود تھے، اس اعتبار سے علامہ موصوف نے عربی ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب تین اہم مقاصد پر مشتمل ہے، اول یہ کہ وہ احادیث اور تفاسیر جو ہندوستان کی فضیلت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اسے درج کر دیا گیا ہے مثلاً آدم علیہ السلام کا سراندیپ میں اترنا، ان کے قدموں کے نشانات کا ہندوستان میں موجود ہونا اور حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو ہندوستان کی مٹی سے ثابت کرنے کے لئے مختلف دلائل پیش کئے ہیں، مثلاً رقم طراز ہیں:

''قال الشیخ جلال الدین سیوطی رحمه الله تعالی فی الدر المنثور فی تفسیر سورة الأحقاف أخرج ابن ابی حاتم عن علی رضی الله عنه قال : خیر واد فی الناس وادی مکة ووادنزل به آدم بأرض الهند'' (سبحۃ المرجان فی آثاری ہندوستان ص:۸)

مقبول احمد صمدانی حیات جلیل میں رقمطراز ہیں:

''ہندوستان کی ایک دلچسپ مختصر تاریخ عربی میں ''سبحۃ المرجان'' نام کی تحریر کی ہے جس میں اس ملک کے خصائص و فضائل وشرائف کے بیان کے علاوہ فضلاء وفقراء کا ایک دلپسند تذکرہ لکھا ہے، ہندوستان کے مخصوص فنون، موسیقی اور شاہد پرستی یعنی ''نایکہ بھید'' پر ایک نہایت مدلل مقدمہ اور مفصل تبصرہ قلمبند کیا ہے''۔ (حیات جلیل، جلد۲، ۱۷۳)

''مآثر الکرام'' ''سروآزاد'' ''خزانہ عامرہ'' ''ید بیضاء'' فارسی زبان میں تالیف کی۔

''مآثر الکرام'' میں عام طور سے ہندوستان اور خاص طور سے علماء وفضلاء بلگرام کا تذکرہ ہے، علامہ بلگرامی نے یہ کتاب لکھ کر اپنے وطن ہندوستان اور بلگرام کا حق ادا کر دیا۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ۱۱۵۰ھ سے پہلے اس کتاب کی تصنیف کی ابتدا کر چکے تھے لیکن درمیان میں سفر حج پیش آیا جس کی وجہ سے مسودہ نا تمام رہ گیا تھا، حج سے واپسی پر ۱۱۵۲ھ میں جب وہ اورنگ آباد آئے تو وطن سے مسودہ منگا کر کتاب پوری کی، اس سلسلہ میں علامہ بلگرامی دیباچہ کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

''قضاء وقتیکہ مصور اندیشہ تصویر ایں کتاب نقش می بست، وصیاد تامل در کمین غزالان مطالب می نشست، سفر حرمین محترمین شرفہما اللہ تعالیٰ اتفاق افتاد، دوست سرگرم کار را از سرعت قدم حالت تعطل روداد، قائد ازل عزشانہ مشت خاک مرا بہ اماکن قدسیہ رسانید، وبعد افاضہ ایں دولت سرمدی بہ گل گشت ممالک دکن مامور گردانید، دریں ایام مسودہ را از وطن طلبیدم و در میزان تعدیل بہ قدر توانائی سنجیدم''۔ (مآثر الکرام علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، ص:۴)

''بلگرام'' ہندوستان کی ایک مردم خیز بستی ہے جہاں سے علم وفضل کے ایسے ایسے گوہر نایاب نکلے ہیں جن کے نام سے یہ قصبہ اور یہ سرزمین ہمیشہ منور رہے گا۔ آزاد بلگرامی نے یہاں کے علماء ومشائخ کے حالات قلمبند کئے، ان علماء وفضلاء کی سوانحی حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان قصبوں میں زندگی بسر کرنے والوں کا ملک پر کتنا بڑا احسان ہے۔ ہندوستان کے نہ جانے کتنے قصبات ہیں کہ وہاں کے لعل وگوہر کو بھلا دیا گیا، اگر وہاں کے تاریخ وتذکرے لکھا جاتے تو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلتا جس سے مؤرخین، مؤلفین اور ادباء کو اسلامی، ادبی اور مذہبی تاریخ لکھنے اور سمجھنے میں بڑی آسانیاں ہوتیں اور نئی نئی شقیں اور راہیں ہموار ہوتیں۔

علامہ آزاد نے ''مآثر الکرام'' کو لکھنے میں بڑی محنت اور جدوجہد کی ہے۔ اپنی تلاش وجستجو کو صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ''اہالی وموالی'' شہر سے بھی رابطہ قائم کیا اور ان سے ان کے حالات دریافت کئے۔ اور جو بزرگوں کی یادگاریں باقی رہ گئی

تھیں ان سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔

آزادبلگرامی نے ''مآثر الکرام'' کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں جولکھا ہے ان کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں کس قدر جانفشانی اور مشقت اٹھائی ہے، رقم طراز ہیں:

''ازسعی بلیغ وجہد وافر پریزادتمنارا بہ افسوں قلم تسخیر کردم، وتصوری کہ وحشیانہ پیرمن خاطرمی گردید، بہ گردید، بہ کلدام تصویر وتحریردرآوردم، وبرائے دریافت ازامنۂ قدماء، تدبیر عجبے بخاطرفرارسید، وجادۂ مستقیمی بہ دلالت رائے صائب طے گردید یعنی بااہالی وموالی شہربرخوردم، وسجلات شرعیہ کہ ازاسلاف دامانده حاصل کردم''۔ (مآثر الکرام علامہ غلام علی آزادبلگرامی،ص:۳)

آزادبلگرامی نے ان علماء وفضلاء کے حالات کے لکھنے میں کسی قدر اختصار سے کام لیا ہے حالانکہ اگر وہ اس زمانہ کی معاشرت، طریقہ، طرز تعلیم اوراسی طرح کی اور چیزوں پر وسیع وعمیق نظر ڈالتے تو یہ کتاب اپنی اندر اور بہت ساری خوبیاں سمیٹ لیتی اور آئندہ نسل کے لئے مشعل راہ ہوتی، علامہ شبلی نعمانی نے ان کے کوتاہ قلمی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سبحۃ المرجان'' اور'' مآثر الکرام'' تذکرہ علماء کی حیثیت سے قابل لحاظ ہیں اگر چہ حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے ہیں لیکن جولکھا ہے مستند لکھا ہے، قدماء کے حالات میں اختصار کے لئے توعذر تھا کہ ماخذوں کا پتہ نہیں لیکن اپنے زمانہ کے علماء میں بھی نہایت اختصار برتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کوتاہ قلمی ان کا خاصہ ہے''۔ (مقالات شبلی ،علامہ شبلی نعمانی ،ص:۱۲۰)

آزادبلگرامی نے اپنے صوبہ اور علاقہ کی بھی تعریفیں کی ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ پورب قدیم الایام سے معدن علم وعمل رہا ہے۔علم وفضل کے چرچے ابھی تک وہاں سنائی دیتی ہیں علم کورائج کرنے کے لئے سلاطین کی طرف سے وظائف وغیرہ مقرر تھے اوراس مقصد کے لئے مساجد اور مدارس، خانقاہیں اور رسدگاہیں بنوائی جاتی تھیں۔دوردراز کے طلبہ کا مرجع بنا ہوا تھا، ان طلبہ کی خاطر ومدارات اہل قصبہ اپنے لئے عظیم سعادت تصور کرتے تھے۔لیکن جیسا کہ معلوم ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی یہ مدارس اور خانقاہیں سرد پڑ گئیں۔درس وتدریس تعلیم وتعلم کے ماحول پر اداسی آگئی۔وہ جوش وخروش سب ماند پڑ گئے۔

''ماثر الکرام'' میں دوفصلیں قائم کیں۔فصل اول میں عام طور سے فقراء کا تذکرہ کیا اور فصل دوم میں خاصطور سے علماء وفضلاء کا ذکر موجود ہے۔

علامہ آزاد کی تذکرہ نگاری میں دوسری اہم کتاب ''خزانۂ عامرہ'' ہے جو خاص کر ان شعراء کے حالات میں ہے جن کو دربارشاہی سے انعامات واکرامات سے نوازا گیا تھا۔اوراس میں ہندوستان ہی کے شاعروں کی تخصیص نہیں ہے۔یہ کتاب علامہ نے اس وقت تصنیف کی جبکہ وہ اپنی عمرعزیز کے ۶۱ ویں منزلیں طے کررہے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی ''خزانۂ عامرہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''شعراء کے تذکرہ میں جوتین کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ''خزانۂ عامرہ'' زیادہ مفصل اور مبسوط ہے۔اس کے دیباچہ میں کتاب کے ماخذ بتلائے گئے ہیں، ان میں ''لب اللباب'' عوفی یزدی کا نام بھی ہے، یہ کتاب ہماری نظر سے گذری ہے''۔
(مقالات شبلی ،علامہ شبلی نعمانی ،ص:۱۲۰)

علامہ شبلی ''خزانۂ عامرہ'' کی مزید افادیت کو تحریر کرتے ہیں:

''اول تو اکثر شعراء کے ذکر میں ایسے شاعرانہ دلچسپ مباحث لکھے ہیں جن میں تنقید کی جھلک پائی جاتی ہے، اور دوسرے یہ کہ جابجا ضمنا ایسے فوائد بیان کرتے جاتے ہیں جو تحقیقات علمی کی جان ہے''۔ (مقالات شبلی ،علامہ شبلی نعمانی ،ص:۱۲۰)

علامہ آزاد کے یہاں ایک خاص بات جو ان کی تقریباً تمام تصانیف میں پائی جاتی ہیں خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق

ہو کہ وہ تصحیح الفاظ اور لغات پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں۔بعض جگہ دقیق علمی مباحث پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں جس سے ان کی علمی وادبی اور عمیقانہ نظر کا ثبوت ملتا ہے۔علامہ نے جگہ جگہ مشکل الفاظ اور نو وارد الفاظ کی لغوی اور معنوی تحقیق کرتے ہیں اور بالفاظ علامہ شبلی نعمانی:''ذرا سے تبدل وتغیر پر اس قدر ہنگامہ آرائی کرتے ہیں کہ گویا وحی الٰہی کا کوئی لفظ ادل بدل ہو گیا ہے''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحت الفاظ کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ان ساری خوبیوں کے باوجود علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ایک تذکرہ میں جو انتخابات ہونا چاہئے اور دراصل یہی چیز تذکرے کی جان ہوتی ہے وہ ان کے تذکرے میں موجود نہیں ہے۔والہ داغستانی،اور آتشکدۂ آزر میں شعراء کے حالات بھی موجود ہیں لیکن اصل خصوصیت یعنی اچھے اور عمدہ شعروں کا انتخاب موجود ہے۔اس کے برخلاف ''خزانۂ عامرہ''ان اوصاف سے خالی ہے

۔

اس کی وجہ شبلی نے خود تحریر کیا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کا شعری مذاق بالکل خراب ہو چکا تھا،مضمون آفرینی پر زیادہ خیال رکھتے تھے اسی لئے اس عہد کے جتنے بھی تذکرے ہیں مثلاً خاں آرزو کے مجمع النفائس اس کی بھی یہی کیفیت تھی جبکہ اس کو اس عہد کا اچھا تذکرہ شمار کیا جاتا تھا۔

''سروآزاد'' میں کچھ ایسے شعراء کے کلام کا انتخاب بھی ہے جو ہندی یا پراکرت میں ہے،(روضۃ الکرام،وصی الحسن بلگرامی،ص:۲۰)''ید بیضاء'' بھی شعراء کے تذکرہ میں ہے۔

مقبول احمد صمدنی لکھتے ہیں:

''شعرائے ہند و ایران کے تین مبسوط تذکرے''ید بیضاء''''سروآزاد'' ''خزانۂ عامرہ''اور بلگرام کے علماء ومشائخ کی ایک عمدہ تاریخ مآثر الکرام فارسی زبان میں تصنیف کی''۔(حیات جلیل ۲،۱۷۳)

مراجع:

۱ حیات جلیل مقبول احمد صمدنی
۲ روضۃ الکرام وصی الحسن بلگرامی
۳ مقالات شبلی
۴ مآثر الکرام علامہ غلام علی آزاد بلگرامی
۵ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان علامہ غلام علی آزاد بلگرامی
۶ خزانۂ عامرہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی
۷ نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر للعلامۃ عبدالحی الحسنی
۸ الاعلام علامہ زرکلی
۹ کشف الظنون کاتب چلپی
۱۰ تاریخ دعوت وعزیمت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سعدیہ سنبل
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظام الملک آصف جاہ: حیات اور کارنامے

چکیدہ: مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں جب دہلی سیاسی افراتفری کا شکار ہو رہی تھی تو ملک کی دوسری ریاستوں میں خودمختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ان ریاستوں میں بنگالہ، دکن اور اودھ کی حکومتیں نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔ان میں آصف جاہی حکومت جس کی بنیاد نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں رکھی۔آصف جاہ نے یہاں وہی شان امارت رائج کیں جو عہد اکبری و شاہجہانی و عالمگیری کا خاصہ تھیں خواہ وہ فن تعمیری ہو، علم و ادب ہو، تہذیب و تمدن ہو۔آصف جاہ خود بھی علم پرور اور علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔جس کے سبب بے شمار علماء و فضلاء و ادباء و شعراء آپ کے دربار سے فیضیاب ہوتے۔علاوہ ازیں آپ کے مزید کارہائے نمایاں پر راقمہ نے اپنے اس مقالے میں روشنی ڈالی ہے۔

کلیدی الفاظ: نظام الملک، تاریخ، دکن، تصنیفات، شاعری، معاصرین

ہندوستان کی تاریخ میں عہد گورکانیان کو ایک اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے، یہی وہ دور ہے جو سرزمین ہند میں عہد زریں کہلاتا ہے۔اس دور میں زندگی کے ہر شعبہ نے ترقی کے منازل طے کئے خواہ وہ فنون لطیفہ کی عمدہ ترین عمارات ہوں یا ان پر کی گئی نفیس نقاشی، یہاں تک کہ ادبیات فارسی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے، جس کے سبب فارسی زبان بام عروج کو پہنچی اور اس خارجی زبان نے سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیا۔اسی وجہ سے ایسے بے شمار اہم ترین شعراء و ادباء ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جنہوں نے فارسی زبان و ادب کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ حیات جاویدانی بھی حاصل کی۔ان گراں قدر شخصیات میں ایک عظیم نام نظام الملک آصف جاہ کا ہے، جو اپنی علمی و سیاسی خدمات کی بدولت تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں روشن و تابندہ نظر آتا ہے۔

آصف جاہ کا اصل نام میر قمر الدین تھا نظام الملک خان دوران خان بہادر آصف جاہ فتح جنگ جیسے اعلیٰ خطابات سلطنت تیموریہ کی جانب سے عطا ہوئے عرصۂ دراز گزر جانے کے بعد بھی عوام الناس آپ کو آصف جاہ اول کے نام سے جانتی ہے ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان میں ولادت ہوئی کسی بھی تذکرے میں جائے پیدائش کا ذکر نہیں ملتا نیک بخت سے تاریخ ولادت نکلتی ہے[1]۔آصف جاہ کے دادا عابد خان عہد شاہجہانی میں سمرقند سے ہندوستان وارد ہوئے آپ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے۔اورنگ زیب جب برسر اقتدار آیا تو عابد خان کو صدارت کل کی خدمات کے ساتھ چین قلیچ خاں کا خطاب بھی ایزد کیا۔ان کی وفات کے بعد شہاب الدین اسی عہدہ پر فرزند ارجمند کے خطاب کے ساتھ خدمات انجام دیتے رہے ،شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں راہ بقالی۔آصف جاہ اسی قابل باپ کے فرزند تھے اورنگ زیب کو ان سے بڑی انسیت تھی لہٰذا والد کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کے بھی سایہ عاطفت میں تربیت پائی، والد کی وفات کے بعد منصب پر فائز ہوئے۔شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں اودھ کی صوبہ داری سے سرفراز ہوئے یہ زمانہ بہت ہی پر آشوب تھا۔عالم گیر کی اولاد میں تخت نشینی کے سبب معرکہ آرائیاں جاری تھیں، ہر ایک داعوی دار سلطنت تھا۔اسی دوران آصف جاہ نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے شاہجہان آباد (دلی) میں خانہ نشینی اختیار کی مگر ذات گرامی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا البتہ جب فرخ سیر برسر اقتدار آیا تو خطابات عالیہ پر نظام الملک بہادر فتح جنگ کا اضافہ کر کے ہفت ہزاری بنا کر دکن کے چھ صوبوں کی حکومت ۱۱۲۵ھ میں عطا ہوئی۔اس پر مسرت موقعے پر میرزا بیدل درج

ذیل ابیات کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہیں جن کی بزم آرائیوں میں ہمیشہ آصف جاہ شامل رہتے تھے اور شعر وسخن پر داد پاتے:

ای امید ایں زماں تماشا کن صبح اقبال عالم ای جاد
نقش بنیاد دشمناں ویراں خانہء عیش دوستاں آباد
خرمنی طبل زدبہ ایں تاریخ ملک خاص دکن مبارکباد[۲]

حالانکہ آصف جاہ کچھ عرصہ بر بعد اس عہدے سے دست بردار ہوئے اور امیر الامراء حسین علی خاں ان کی جگہ فائز ہوئے تو آصف جاہ دارالخلافہ واپس آ گئے ۔اس کے بعد مراد آباد و مالوہ کی صوبہ داری پر سرفراز ہوئے ،اسی درمیان غلام علی آزاد بلگرامی بیت اللہ شریف کے لئے روانہ ہوئے مالوہ کے مقام پر آصف جاہ سے ملاقات ہوئی،اوران کی کامیابی وکامرانی کے لئے ذیل کی رباعی پیش کی:

ای حامی این محیط جود و احساں حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بدر گاہ سلیمان آورد نو آل نبی را بہ در کعبہ رسا[۳]

ہندوستان کے لیے یہ زمانہ نہایت نازک تھا،سلطنت زوال پذیر ہورہی تھی اراکین دولت ان حالات سے سخت مخدوش تھے۔ ہرایک ان کی مخالفت کرتا تھا چنانچہ محمد شاہ نے مبارز خاں ناظم کو دکن کی صوبہ داری عطا کی ،آصف جاہ نے مبارز خاں کو برار کے مقام پر شکست دی اور دکن پر قابض ہوگئے ۔اس موقعے پر محمد شاہ نے ان کی دلجوئی کی اور ۱۱۳۸ھ میں آصف جاہ کا خطاب اپنی جانب سے عطا کیا۔لچھمی نارائن شفیق اپنی تاریخی تصنیف حقیقت ہائے ہندوستان میں رقمطراز ہیں کہ کس شان وشوکت کے ساتھ دکن کی صوبہ داری حاصل کی:

''سرغزل طبق یازدھم از افراد دفتر قدیمہ حقیقت محال صوبجات دکن دروقت نواب مغفرت مآب آصف جاہ نظام الملک کہ درسنہ یک ھزار ویکصد وبیست ونہ فیصلی فرد گوشواری بنظر گذشت صوبہ نود وسہ سرکار یک باسم اسلام کدہ عرف دیوکدہ''[۴]

دکن کی امارت پر معمور ہونے کے بعد آصف جاہ کو مدت العمر رعایا کی خیر خواہی وعافیت کا خیال رہا۔ برہان پور میں ۱۱۶۱ھ وفات پائی جسد مبارک کو اورنگ آباد لایا گیا۔شاہ برہان الدین قدس سرہ کے روضۂ مبارک میں مدفون ہوئے ،متوجہ بہشت سے تاریخ رحلت نکلتی ہے۔حاجت مندان ایران وہند آپ کے چشم فیض کے زمرد چنے کو بے قرار رہتے ،عدل گستری وخیر گیری یہاں تک کہ رعایت کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ جبر وتشدد کا نام تنسیخ ہوگیا،ان کی ادب نوازی وعلم پروری وفیاضی کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی ہر جانب سے علماء وفضلاء وشعراء ان کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے جس کا ذکر صمصام الدولہ نے اپنی تصنیف مآثر الامراء میں کیا ہے ترجمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

''عجیب فرشتہ صفت تھے اور نیکی ان کی جبلت تھی ان کی سرکار سے ہمیشہ فقراء علماء وصلحا اور دوسرے مستحقین کے ساتھ ان کی قسمتوں کے مطابق نوازش ہوتی تھی،عرب ماوراالنہر،خراسان،عراق اور اطراف ہند کے علما ومشائخ ان کی قدر دانی کا شہرہ سن کر دکن آتے اور ان کے شیلان کثیر الالوان سے زلہ ربائی کرتے تھے''[۵]

آصف جاہ کے معاصرین میں آزاد بلگرامی ،امید قزلباش ، بیدل ، ناصر علی سرہندی ،صمصام الدولہ،امرالامراء حسین علی خاں ، بندرابن داس خوشگو جیسے نامور شعراء وادباء وعلماء گزرے جو نہ صرف اپنے عہد کی اہم ترین شخصیات میں شمار ہوتے بلکہ یہ وہ فنکار تھے جنھوں نے اپنے شہ پاروں اور علمی خدمات کی بدولت اپنی شہرت کا غلغہ خود اپنے کانوں سے سنا،ان معروف ہستیوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے غیر معروف لیکن اہم ترین شعراء وادباء بھی ان کے ہمعصر گزرے ہیں۔جن کا ذکر تو تذکروں اور تاریخوں میں ملتا ہے لیکن ان کا نادر و نایاب کلام اب تک صرف مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہے۔ان غیر معروف شخصیات میں میر میزان

رازؔ، درگاہ قلی خاں، میر محمد نعیم خاں نصرتؔ، شیخ مہدی علی ذکیؔ، مرزا اطف اللہ محمورؔ، عارف الدین خاں عاجزؔ، میر قاسم خاں عاشقؔ وغیرہ جیسے غیر معروف شعراء شامل ہیں جن کا کلام صفحہ قرطاس پر جگمگانے کے لئے منتظر ہیں۔

آصف جاہ معقولات ومنقولات کے ماہر تھے، رزم آرئیوں میں اپنے ہنر وفن کی داد لینے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی ،ترکی و ہندی میں نظر بالغہ رکھتے تھے، لہٰذا سخن سنج کی حیثیت سے ادبیات فارسی میں اہم مقام ومرتبہ حاصل کیا۔ان کی بزم سنجیاں ادب کے گلستان میں ابھی تک گونج رہی ہیں۔فن شاعری میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے کسب فیض سے سرفراز ہوئے۔ابتداء میں شاکرؔ تخلص کرتے تھے، پھر جب آصف جاہ کا خطاب ایزد ہوا تو آصفؔ اختیار کیا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کا دیوان نہایت ضخیم ہے اوراق کی تعداد ۱۰۲۸ ہے مطبع سرکار آصفیہ سے طبع ہو چکا ہے کلام زبان کی سلاست، روانی، فصاحت وبلاغت کی اعلیٰ قدروں سے مزین ہے کیونکہ آصفؔ شاعری میں بیدلؔ سے اصلاح لیتے تھے اس لئے بیدلؔ کی سی شاعرانہ خصوصیات جیسے نازک خیالی، تخیل آمیزی، مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے جو سبک ھندی کا خاصہ ہے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔جس سے واضح ہوتا کہ شاعر کو خیال بندی ونازک خیالی میں خاصی مہارت حاصل تھی دیوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نیست از بیگان چشم تر خم داشتن　　این توقع راز یار آشنا داریم ما
از پناہ دیگران باشد پناہ ما قوی　　ھرکس اینجا گرکس دار دخدا داریم [۶]

ان کے دیوان میں جدت پسندی کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے، کلام میں پیوست صنائع شعری اور لطائف معنوی نہایت دلکش معلوم ہوتی ہیں، جا بجا عمدہ ترین تشبیہات واستعارات وپند ونصیحت وطنز اس میں مزید جاذبیت پیدا کرتے ہیں، علاوہ ازیں عشق حقیقی کے دشوار گزار راہوں کو بہت ہی سلیقہ اور معنی خیز الفاظ میں بیان کرتے ہیں جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

چو خم شد پشت زلف تابدار　　شد ھر تار مو بھرش عصائی
آمیزش و انس او بعاشق　　بیگانہ کی آشنا ست اینھا
گہ دین گہ چشم پوشی　　در دور تو فتنہ ھا ست اینھا [۷]

ان کے یہاں انسان دوستی بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ اس جذبہ کو انہوں نے اور بھی زیادہ دلکشی کے ساتھ بہترین اشعار کا جامہ پہنایا۔ نیک دل اور امن پسند شخص ہونے کے باوجود ان کی زندگی کا بیشتر حصہ میدان کارزار میں گزرا، جس کی تباہ کاریوں اور سختیوں کا ذکر آصفؔ اپنے کلام میں گاہ بگاہ کرتے ہوئے سخت آزردہ نظر آتے ہیں:

از حنا تا پای او رنگین در آمد در نظر　　دردل خونین شکایت از حنا داریم ما
از تصور کردن روی چمن پیرای او　　در نظر آصف چہ باغ دلکشا داریم ما [۸]

ان کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ رباعیات بھی شامل ہیں جو کلام کو اور زیادہ زینت بخشتی ہیں، ان رباعیات میں بے ثباتی دنیا کا نقشہ، شکایت روزگار، واعظ پر طنز بھی ہے اور ایک سچے جذبات نگار کی حیثیت سے شدت تاثر وواقیعت کی فراوانی بھی پیوست ہے جس سے اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو:

ای آنکہ قوی ساختہ امید توئی　　بخشیدہ بدل مراد جاوید توئی
ظاھر ز تو روشن ست باطن از تو　　صیقلگر آئینہ و خورشید توئی [۸]

ایک مثنوی خسرو شیرین کے نام سے ہے جو دیوان میں شامل نہیں یہ مثنوی بھی ان کا اہم ترین کارنامہ ہے۔جو انہوں نے بادشاہ عالم گیر ثانی کے عہد حکومت میں نظم کی۔آصفؔ کی مثنوی نظامی کی مشہور ترین مثنوی خسرو شیرین کے تتبع میں ہے نہایت دلکشی کے ساتھ نظم کا جامہ پہنایا، یہ مثنوی فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، آصفؔ اپنی مثنوی کا آغاز حسب ذیل اشعار سے کرتے ہیں:

خداوندا رھی از غیب بکشای ز غیم چشم دل بر عیب بکشای
بھر عیبی کہ باشد عیب نا کم بر حمت کن ز غیب از عیب پا کم[9]

آصف جاہ کے معاصرین نے جابجا ان کی حوصلہ افزائی و مدح سرائی کی ہے۔ ان ہی میں ایک نواب امین الدولہ ہیں، جنہوں نے آصف کی مدح میں قصیدہ نظم کیا کہ کس طرح ان کے دورحکومت میں ہند کا صوبہ دکن امن وسکون کا گہوارہ بن گیا اور ہنروفن کے ماہرین ان کے دربار سے منسلک ہوکر فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے، جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

دمید مغمہ ز منقار بلبل خوشگو چوگلبنی کہ ازو بشگفد گل رعنا
فزود حسن چمن از سحاب گوھر بار چنانچہ شان وزارت ز عمدۃ الوزرا
نظام ملت و ملک افتخار اھل کرم قوام دین و دل آفتاب مجدوعلا
بود بحسن وزارت بہ از نظام الملک کہ نقش ثانی بھتر کشد نگار آرا[10]

مجموعی طور پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تیموریوں کے دورحکومت میں علم پروری ادب نوازی شان امارت میں داخل تھی اس لیے امرا ٔ و وزرا ٔ بھی اپنی محفلوں کو علم وادب سے پر رونق رکھتے اور یہی صفات آصف جاہ میں بے حد موجود تھیں۔ آصف جاہ بیک وقت انسان دوست، مشفق، رحم دل وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادب پرور وسخن فہم وسخن سنج شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اورنگ زیب، بہادر شاہ اول، جہاں دار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ کی انقلابی و بے اطمینان حکومتوں کے زمانے میں اپنی زندگی کو وفا داری وایمانداری ودیانتداری کے اصاف حمیدہ سے باہر نہ جانے دیا۔ صوبۂ دکن کو زیر کرنے کے بعد وہی شان وشوکت روا کیں جو گورکانیان ہند کی اعلیٰ قدریں تھیں اسی وجہ سے یہاں کی ہر ایک شئے پر عہد مغلیہ کے نقش ابھرتے نظر آتے ہیں لہٰذا عہد آصف جاہی میں ادبیات فارسی اپنی پوری تابنا کی ودلکشی ورعنائی کے ساتھ جلوہ افروز نظر آئی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حواشی:

۱۔ سخنوران بلند، فکر ص ۴۵۔۲۔ میرزا بیدل، ص ۵۲، ۳۔ سخنوران بلند فکر، ص ۴۵۔، ۴۔ حقیقت ھائے ھندوستان، ص ۳۸، ۵۔ دیوان نظام الملک آصف جاہ، ص ۲، ۶۔ ایضاً۔۔۔ص ۸۱۲، ۷۔ ایضاً۔۔۔ص ۲، ۴، ۷، ۸۔ ایضاً۔۔۔ص ۱۰۲۸، ۹۔ مثنوی خسرو شیرین، ص ۱، ۱۰۔ مآثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد، ص ۱۸۲

کتابیات:

۱۔ سخنوران بلند فکر، مولوی محمد منور بہادر گوہر، مدراس پرنٹرز ۱۹۳۷ء
۲۔ میرزا بیدل، نبی ہادی، مکتب جامعہ یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ، ۱۹۸۲ء
۳۔ سخنوران بلند فکر، مولوی محمد منور بہادر گوہر، مدراس پرنٹرز ۱۹۳۷ء
۴۔ حقیقت ھائے ھندوستان، نرائن لچھمی شفیق، قلمی نسخہ ۱۲۱۰ھ فارسیہ اخبار ۱۰۰ مولانا آزاد لائبریری،
۵۔ مآثر الامراء، صمصام الدولہ، شاہ نواز خاں، جلد سوم اشیاٹک سوسائٹی پریس کلکتہ ۱۸۸۸ء
۶۔ سفینۂ خوشگو، بندرابن داس خوشگو، مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمن، لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
۷۔ مآثر الامرء، صمصام الدولہ، مترجم (پروفیسر محمد ایوب قادر) جلد سوم، مرکز اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء
۸۔ مثنوی خسرو شیرین، آصف جاہ، مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء
۹۔ دیوان نظام الملک آصف جاہ، میرزا نصر اللہ خان دولت یار جنگ، مطبع سرکار اعلیٰ حضرت قدر قدرت حیدرآباد
۱۰۔ مآثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد، غلام علی آزاد بلگرامی، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۳ء
۱۱۔ صبح گلشن، محمد عبدالمجید خان، مطبع فیض شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۵ھ
۱۲۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۱ء

ڈاکٹر ثنا کوثر
شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

منشی نول کشور بحیثیت مورّخ اور ''تواریخ نادرالعصر'' کا تجزیاتی مطالعہ

منشی نول کشور ایک عالم، مولّف، مورّخ، صحافی، ناشر اور انسان دوست کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا عہد ۱۸۳۶ء سے ۱۸۹۵ء تک ہے۔ ان کی شخصیت کی تابناک شعاؤں نے ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی ہندوستانی تہذیب وتمدّن کو روشناس کیا۔ ۵۹ سالہ زندگی میں انھوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جسے شاید کوئی شخص اتنے وقت میں مکمل نہیں کر سکتا۔ منشی نول کشور ۱۸۳۶ء میں متھرا میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں علیگڑھ آئے۔ ۱۸۵۱ء میں آگرہ کالج سے تعلیم حاصل کی اور اخبار ''سفیر آگرہ'' سے وابستہ ہوئے۔ ۱۸۵۳ء لاہور میں اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر ہوئے اور ۱۸۵۶ء میں اخبار کوہ نور کے مالک منشی ہرسکھ رائے کی گرفتاری کے بعد اخبار کی ادارات وطباعت کی ذمّہ داریاں سنبھالی۔ اسی درمیان لاہور میں ان کی ملاقات پنجاب کے ڈپٹی کمشنر کرنیل ایبٹ سے ہوئی، جو بعد میں مخلصانہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ۱۸۵۸ء کے اوائل میں منشی جی نے لکھنو میں مطبع نول کشور کی بنیاد ڈالی اور ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار کا پہلا شمارہ جاری کیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ لکھنو آئے تب کرنیل ایبٹ کا بھی تبادلہ لکھنو میں کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ہو گیا تھا۔ منشی جی نے کرنیل صاحب کی مدد سے چھپائی کے اسباب وآلات کلکتہ سے لاکر مطبع میں کام شروع کیا۔ جو ان کی محنت وکاوش کے سبب دن رات ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔

۱۸۶۳ء میں جب کرنیل ایبٹ نے ۱۵ مہینے کی رخصت لے کر ولایت جانے کا فیصلہ کیا، تب روساء اور عمائدِ لکھنو نے اُن کی شان میں جشن تقریب کا اہتمام کیا۔ منشی جی نے بھی ایک کتاب بعنوان 'تواریخ نادرالعصر' بطور تحفہ کرنیل ایبٹ کو پیش کی۔ اس کے متعلق منشی نول کشور لکھتے ہیں:

''اخیر ۱۸۵۸ء لکھنؤ کا اتفاق ہوا یہاں جناب فیضمآب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کی ملازمت کیمیا خاصیت سے جو ہوشیار پور متعلقہ پنجاب کی ڈپٹی کمشنری سے عہدۂ جلیلۂ کمشنری اور سپرنٹنڈنٹی قسمت لکھنؤ متعلقہ صوبہ اودھ پر تشریف لائے تھے۔۔۔۔ بسکہ پنجاب میں مطبع متعلقہ راقم کا حسن اہتمام قدردانی حکام سے مشہور تھا۔۔۔۔۔ اب کہ ۱۸۶۳ء میں صاحب محتشم الیہ پانچ برس کے بعد اسائش روحانی اور صحبت وبدنی کے لیے ۱۵ مہینے کی رخصت لے کر عازم ولایت ہونے لگے۔ صاحب موصوف کے احباب کیا صاحبانِ ذی رتبہ کیا روساء وعمائدِ شہر کو جدائی ان کی بہت شاق گزری اس تقریب میں سپاس نامے پڑھے گئے دعوتیں ہوئیں۔ بقول آنکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ حقیر نے بھی موقع مناسب سمجھ کر ہفتے عشرے کے اندر یہ عجالہ تالیفات قدیمہ سے انتخاب کر کے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھا کر اس بضاعت مزجات کو پیشکش خدام عالیمقام کیا کہ تا تشریف آوری بطور یادگار تعویز بازو رہے روزگار رہے اور اس نام نامی کہ مجکو اور میرے مطبع کو تبرک حاصل ہو۔'' [1]

نادرالعصر دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب میں ۱۹۸ صفحات اور مختصر ۱۳۶ ابواب ہیں۔ پہلے حصّہ میں صفحہ ۱ سے ۲۴ تک کرنیل ایبٹ کی حالات زندگی اور لکھنؤ سے ولایت جانے کے موقع پر جشن تقریب سے متعلق ۶ باب اور دوسرے حصّہ میں کُل

۴۷ اصفحات میں لکھنؤ کی تاریخ اور نوابین اودھ کا تذکرہ ہے۔

منشی نول کشور سے قبل اودھ کی تاریخ کے کوئی مستقل نمونے نہیں ملتے ہیں۔ اگر چہ ۱۸۲۴ء میں لکھی گئی رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب موجود ہے لیکن اس کی زبان مقفع اور مسجع ہے۔ نادر العصر کے بعد گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر، فسانۂ آزاد رتن ناتھ سرشار، امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا وغیرہ میں اودھ کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اوّلیت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ نادر العصر میں ہندوستانی حکومت کی تاریخ کو بھی منشی جی نے بہت ہی قرینے سے تحریر کیا ہے۔ ہندو راجاؤں کے حالات، مغلیہ حکومت اور اودھ کے نوابین کے مختصر حالات پیش کر کے انھوں نے تاریخ کے باب میں اضافہ کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب انگریز حکام کو خوش کرنے اور نذر کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ لیکن منشی جی کی ذہانت اور وطن پرستی کا جذبہ دیکھئے کہ انھوں اس میں محض کرنیل ایبٹ کے لیے قصیدے پیش نہیں کیے بلکہ اپنے ملک کی تاریخ کے ایک حصّہ کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے انسان دوستی کے ساتھ ساتھ اپنے وطن پرستی کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔

نادر العصر کے پہلے حصّے میں منشی جی نے کرنیل صاحب کے ہندوستان میں ۱۸۲۸ء سے ۱۸۶۳ء تک کے ۳۵ سالہ سفر کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ اختصار سے پیش کیا ہے۔ اور جو تقریب ان کی شان میں منعقد کی گئی تھی اسے بھی مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۸۲۸ء میں کرنیل صاحب موصوف بعہدۂ انسائین ولایت سے داخل کلکتہ ہوئے اور دوسرے سال اسی عہدے پر مقرر ہو کر ہندوستان بھیجے گئے ۔۔۔۔۔۱۸۳۸ء میں گورکھپور۔۔۔۔۱۸۴۴ء میں لدھیانہ۔۔۔۔۱۸۴۹ء میں ہوشیار پور کے عہدۂ صاحب ضلع۔۔۔۔جبکہ ۱۸۵۸ء میں سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر چیف کمشنر ہوئے اوسی عہدۂ کمشنری پر مستقل فرمایا اور ماہ اپریل میں لکھنؤ تشریف لائے ہوئے پورے پانچ برس ہوئے اور اوسی جگہ عہدۂ کرنیلی کا حاصل کیا۔'' [۲]

یہ جلسہ ۲۴ مارچ سہ شنبہ ۳ بجے چھتر منزل میں منعقد ہوا تھا۔ نواب محسن الدولہ بہادر نے تمام روساء اور عمائدِ لکھنؤ کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا تھا، جسے منشی جی نے کتاب میں نقل کیا ہے۔ اس سپاس نامے کا کرنیل ایبٹ نے بہت ہی ممنونیّت کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ منشی جی نے تعریفی کلمات کے ساتھ اسے بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

منشی نول کشور اس دور میں مشترکہ تہذیب کے اہم نمائندے کے طور پر نظر آتے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ کی ابتدا میں ان کی تحریر سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان میں مذہب کے نام پر الگ رہنے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک ملک میں رہ کر مذہبی عقائد کے سبب علیحدگی اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ نول کشور اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ مذہب کے نام پر لوگ دوسرے مذہب کی تصانیف میں فرق کرتے ہیں اور اس کی حفاظت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس وجہ سے ہندوستان کا بہت بڑا سرمایہ ضائع ہو گیا۔ ہندوؤں نے بدھ مذہب کے ذخیرے کو تباہ کیا اور بدھ نے ہندوؤں کے اور مسلمانوں نے بھی یہ ہی رویّہ اختیار کیا۔ لیکن ان سب وجوہات سے نقصان ہندوستان کا ہی ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہماری محکومی کی خاص وجہ نا اتفاقی اور تعصب کو قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کو واضح طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے، جس سے منشی نول کشور کے ذہنی ارتقاء کو سامنے لایا جا سکے۔ اور ان کا یہ نظریہ جو آج سب پر آشکار ہے کہ انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے، اس کو ان کی ہمدرد اور بے تعصّبانہ شخصیت سے ثابت کیا جا سکے۔

کتاب نادر العصر کا دوسرا حصہ تاریخ پر مبنی ہے۔ اس کی ابتدا نول کشور نے برہما کے دنیا میں آنے سے کی ہے۔ جس کی بنیاد ان کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے ہندو راجاؤں سے واجد علی شاہ کی حکومت تک کا تذکرہ کیا ہے۔ ابتدا میں شری رام چندر، راجا سورج بنسی اور چندر بنسی کی حکومت کو ضمناً پیش کرتے ہوئے راجہ جدشٹر کے عہد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے

بعد اسلامی حکومت کو ۳ صفحہ میں بیان کر کے ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کا بیان اور ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی ملکہ وکٹوریہ کی حکومت اور ان کی فوج جو ہندوستان میں حاکم بنے ہوئے تھے اور مختلف اضلاع کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کہلاتے تھے۔اس کے بعد اودھ کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔جس میں اس زمانے کے بادشاہ اور امراء کا بیان خاصہ اہمیت کا حامل ہے۔

نول کشور نے اس باب کے بعد ہندوستان میں علم کی اہمیت کو ایک اقتباس میں پرویا ہے۔جو اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستان ابتدا سے ہی علم کا گہوارہ رہا ہے۔چونکہ نولکشور ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اس لیے مثال کے طور پر ہندو اپنشد اور ویدوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ اہل یورپ، مصر اور اہل یونان نے ہندوستان سے علم، صنعت و حرفت حاصل کیا ہے۔منشی جی کی اس بات پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شری رام چندر کی حکومت اور ابتدائی راجاؤں کے عہد کو تو مثال کے طور پر پیش کیا ہے لیکن مسلم حکومت کا ۶۰۰ سالہ عباسیہ عہد اور ۴۰۰ سال کی مغلیہ حکومت کو کیوں نظر انداز کیا؟ جس سے مسلمانوں کے علم، صنعت و حرفت کا بخوبی اندازہ لگایا جاتا ہے۔لیکن منشی نول کشور کی بے تعصّبانہ شخصیت کو دیکھتے ہوئے جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ تفصیل سے اس کا بیان کرتے تو مسلم مذہب اور دوسرے علوم کا بھی تفصیل سے ذکر کرتے۔

تاریخ کے باب میں علم کی اہمیت اور افادیت کو درمیان میں اس طرح بیان کرنا منشی جی کی علم سے دلچسپی اور ترقی کی بہترین مثال ہے۔اگر وہ اس کا بیان نہیں کرتے تو اودھ کی تاریخ میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

منشی نول کشور نے ہندوستان کو دنیا کے ملک کا مجموعہ کہا ہے۔جسے ثابت کرنے کے لیے ان تمام خوبیوں کا ضمناً بیان کیا ہے جو ہندوستان کی وحدت کو ظاہر کرتی ہیں۔مثلاً یہاں کے موسم، فصلیں، کہستان، میدان، بیماریاں، دارالشفا، باغ، خصوصاً یہاں کے باشندے، مذہب، تہذیب، جدول معدنیات کی بھی لمبی فہرست پیش کی ہے۔

اودھ کے نام گرامی کے متعلق منشی نول کشور نے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں اسے اوتر کوشل کہا جاتا تھا۔دفتر شاہی اور انگریزی عہد میں صوبہ اودھ لکھا جاتا ہے۔شری رام چندر کے عہد سلطنت میں اجودھیا اس کا دارالسلطنت تھا اور نوابوں کے عہد میں لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت تھا۔مردم شماری، کثرت آبادی، زراعت، پیداوری، آمدنی وغیرہ میں یہ ہندوستان کا بڑا صوبہ شمار کیا جاتا تھا۔انھوں نے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسی لیے انھوں نے تمام حالات کو بغیر کسی کتاب کے بخوبی بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس ملک میں قبل ۱۸۶۳ء چار کمشنری تھیں اب صرف تین کمشنری رہ گئیں لکھنؤ، خیرآباد اور فیض آباد۔'' ۳

منشی نول کشور چونکہ لکھنو ضلع کے کمشنر کرنیل ایبٹ کو یہ کتاب بطور تحفہ پیش کرنا چاہتے تھے، اسی لیے لکھنؤ کی تاریخ و حکومت کا بیان کیا ہے۔لکھنؤ کے اضلاع میں انھوں نے دریا آباد (جو اب بارہ بنکی کے نام سے جانا جاتا ہے)، رائے بریلی، اونام، خیرآباد، ہردوئی، سیتاپور، لکھیم پور، بہرائچ، فیض آباد، سلطان پور، پرتاپ گڑھ وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہ اضلاع لکھنؤ سے کتنی میل دور ہیں، وہاں کے کمشنر، تحصیل اور ضمناً حالات کا بیان کیا ہے۔اس کے بعد صفحہ ۵۲ سے اودھ کے نوابین کا ذکر ہے۔ان میں نواب سعادت خاں برہان ملک، نواب صفدر جنگ، میر قاسم خان، نواب شجاع الدّولہ، آصف الدّولہ، علی خان بہادر، غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر، رفیع الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ کی ریاست و حکومت کا تذکرہ ہے۔

نواب شجاع الدّولہ کے عہد حکومت میں ریاست بندیل کھنڈ کی شورشوں کا بیان کیا ہے۔اور احمد خاں بنگش فرخ آبادی کی مرہٹوں سے جنگ اور نواب شجاع الدّولہ کی ریاست میں ہنگاموں کی وجہ سے نظام حکومت کا کمزور ہو جانا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔صفحہ ۱۲۷ سے نواب آصف الدّولہ اور نواب سعادت علی خان کے عہد حکومت میں لکھنؤ میں جو تعمیری کام ہوا، مثلاً مکانات شاہی

ان میں کوٹھی بیا پور، کوٹھی دلکشا، ولایتی باغ، کوٹھی مارتین (جسے انگریزی میں کینسٹین ٹیا بھی کہتے ہیں)، نہر گنگ، سکندر باغ، قدم رسول، نجف اشرف، موتی محل، خورشید منزل، تاراوالی کوٹھی، میدان جو قیصر باغ میں واقع ہے، مقبرہ سعادت علی خاں، چتر منزل، کوٹھی فرحت بخش، کوٹھی رزیڈنسی، پل آہنی، قلعہ مچھی بھون، بڑا امام باڑا، جامع مسجد، رومی دروازہ، دولت خانہ، امام باڑہ حسین آباد، موتی باغ، درگاہ حضرت عباس وغیرہ کا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ جس سے اس زمانے کے حالات اور نوابوں کی حکمت عملی اور کاریگری کے احوال معلوم ہوتے ہیں۔ آخری باب میں انھوں نے شہر لکھنؤ کے باشندوں کا حال رقم کیا ہے جن میں شاہ، نواب، اہل علم، امراء، شرفاء وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

نول کشور نے یہ کتاب وقت کی کمی کے باعث بہت ہی عجلت میں لکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود تمام بادشاہوں کا تذکرہ جس تہذیب اور تعظیم سے کیا ہے وہ نہایت ہی قابل داد اور لائق تحسین ہے۔ انھوں نے درباروں کے رسم ورواج، طور طریقے اور تاریخی واقعات کو دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے۔ نواب سعادت علی خاں کے متعلق رقمطراز ہیں:

''نواب سعادت خان سے واجد علی شاہ تک ایسا بیدار مغز عالی فہم عقیل کوئی صاحب سندِ تخت نہیں ہوا۔'' ۴

آصف الدّولہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نواب آصف الدّولہ نے حکومت اطمینان کے ساتھ کی اور کوئی مخالف اونکا زبردست خلل انداز ریاست نہ تھا۔ لکھنؤ کی آبادی اور فیاضی وسخاوت زبان زد خلایق ہے۔ یہ نواب ۵۱ سال کئی مہینے کی عمر میں دنیا سے گزرے۔'' ۵

منشی نول کشور نے کتاب میں اس دور کے زبان واسلوب کے اعتبار سے قدیم الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اُس زمانے میں الفاظ بیشتر طور پر اضافت کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ منشی جی نے اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً بہت سے الفاظ کو 'ؤ' کے ساتھ لکھنا: اوسکے، اونکے، اونکی، اوسمین وغیرہ نون غنہ (ں) کی جگہ نون (ن) کا استعمال جیسے دونون، انھون نے، ازان، حجامون، پانون، جہان، گاؤن، میان، برہمون، ہین وغیرہ اور 'تیار' کو 'طیار' لکھا ہے۔ فارسی الفاظ کا بھی برمحل استعمال ہے جیسے ازبس، پنج شنبہ، آنکہ، کس، اوست وغیرہ۔

نادر العصر میں نول کشور ایک مؤلف نہیں بلکہ مصنف کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور انھوں نے ایک کامیاب مورّخ کا حق ادا کیا ہے۔ کتاب کے کسی بھی حصّے میں بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ اس زمانے کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جو ان کی فن کاری کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ حکومت برطانیہ نے منشی نول کشور کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا اور انھیں ۱۸۸۸ء میں ''سی آئی ای'' کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ پیش کیا۔ شاہ میر کے یہ اشعار ان کی شخصیت کو بخوبی پیش کرتے ہے:

بڑا کام تیرا ہنر کر گیا — کہ خود سے مجھے با خبر کر گیا
چمکتے ہوئے نقش پا چھوڑ کر — فروزاں ہر ایک رہ گزر کر گیا
نئی منزلوں کے بتائے سراغ — کڑی راہ کو مختصر کر گیا

حواشی

۱ تواریخ نادر العصر مؤلف نول کشور تقدیم از ڈاکٹر انوار الحسن، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۰ء ص ۱-۲
۲ ایضاً ص ۳-۸
۳ ایضاً ص ۳۶
۴ ایضاً ص ۷۸
۵ ایضاً ص ۷۲

ISSN: 2394-5567 **UGC No. 47011** **S. No. 16**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: V ISSUE: IV

OCTOBER-DECEMBER 2018

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Professor Abdul Qadir Jafery, Allahabad

Prof. Masood Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Chairman, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, HOD Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat Degree College, Lucknow

Co-Editor

Atifa Jamal

Research Scholar

Department of Persian

Lucknow University, Lucknow

Abdul Rahman Ansari

Research Scholar, Department of Persian

University of Delhi-110007

Introduction of Tazkira-i-ilahi (V: 1, the only manuscript of Jaunpur)

Mir IlahiHamdani, a reputed poet of sixteenth century whose persona is marked by anonymity, was born in Asadabadof Hamdan, there he received traditional and primary education and traveled to Shiraz afterwards for further educationwhere he stayed in Madrasa of Shah Daee's shrine. In 10th century Shiraz used to be a hub of intellectuals and a perfect place to nurture scholarship. Numerous collection of poets, innumerable treatises and chronic were available from which he enriched knowledge of language and literature. Mir Ilahi utilized the opportunity tremendously and gained command over Arabic and Persian literature which caused to develop poetic taste and attracted him towards historiography.

Mir IlahiHamdani hadyearlong vision to author an anthology of Indo-Persian poets. During his stay in Shiraz he admits to have collected treasury of renowned Persian poets and it can be regarded as his first attempt to jotting down biographies and literary achievements of poets. Unfortunately that collection was lost and Ilahi expresses his regret on it[1].

He mustered courage again to write long dreamt anthology and preferred Lobabul-Albab and Arafat-ul-Aashiqin to be his primary consult and chose to follow the method of Arafat-ul-Aashiqin that comprises three part. First part deals with classical poets, and second revolves around the medieval poets and third depends on contemporaries. Ilahi could not accomplish this voluminous work and second volume of Tazkira-i-ilahi which was predetermined to be dedicated to poets of medieval age, unfortunately remained incomplete.

However, first volume of Tazkira-i-ilahi is complete and renders detailed account of around 642 literary personalities including monarchs, patrons, poets, mystics, scholars, theologians, calligraphers and Juris consults etc. There is no primary or secondary evidence which could indicate when

[1]Tazkira-e-Ilahi (Berlin) P: 120

Ilahi started this anthology. He admits it that during his stay in Agra (1034 A.H) he drank wine in India for the first time at the age of thirty and mentioned the incident in second volume. On this basis it can speculated that the first volume was completed before 1034 A.H, and the second volume was under its way.

Mir Ilahi was privileged to have lived during the golden age of Mughals, received royal patronage and pursued a well-recognized place in his poetic endowment, apart from Diwan, Tazkira-i-ilahi is considered as most distinguished work of IlahiHamdani and he proudly regards himself as an anthologist but tragically the anthology remains unknown. None of his contemporaries wrote about the anthology and even TaqiAwhadi who was confidant of Ilahi, did not mention a single word about his Tazkira. Ahmad GulchinMa'ani also wonders how the anthology of a well-known poet relegated to literary hoardings[2].Sprenger has answered it very wisely that "The book has not preface and has never been completed and it is therefore perfectly unknown[3]".

Apart from colophon, amid the biography of poets Mir Ilahi frequently states the name of his anthology as "Tazkira-i-ilahi" or "Khazina-i-ganje-ilahi". Due to lack of substantial evidence the place of its completion remains clueless but the colophon justifies that it was scribed in 1065 AH, one or two year after Ilahi's demise.

In medieval period, authors used to present copies of their books to Emperors, nobles and others for a wide circulation of their work. These manuscripts used to be preserved and accessible in royal and public libraries. Manuscript of Tazkira-i-ilahi may have been scribed in Kashmir and anonymously survived for centuries. Finally in 1972, eminent face of Iqbaliyaat professor Abdul Haq discovered it with broken spine and confounded pages in the library of Khanqah-i-Rashidiya,Jaunpur, which had already produced a rare manuscript of Diwan-i-Hafiz and Al-Musannaf.Professor Abdul Haq published facsimile of the manuscript with his own preface dealing with life and works of Mir Ilahi.

The manuscript has 700 page, 15 lines on each, size is 1/9X4 and the manuscript is quite challenging in terms of reading the text. It has been a prey of moth infestation and hugely affected by environment that has resulted imprints and broken margins. This manuscript is now being preserved in personal collection of Professor Abdul Haq.

---

[2]- تاریخ تذکره های فارسی، ص: ۵۱۸

[3]A catalogue of the Arabic, Persian and Hindutany manuscripts of the King of Audh, P:67

Professor Abdul Haq asserts that this manuscript has been scribed by Mir Ilahi himself. In medieval age scribes were used to be hired for making copies of manuscripts and rates of fascinated inscriptions of famous calligraphers were expensive. It can be apparently noticed that the scribe of this anthology was a seasoned and professional calligrapher who scribed it in Nastaliq from end to end. All over the book, style of calligraphy isthesame whereas margins have been scribed in "Shikasta". Scribing in the same form first page to its end is a challenging task for non-professionals. Several pages of its second volume have been scribed by non-professional scribe possibly it can be handwriting of Mir Ilahi.

To highlight the names of new biography (Tazkira) the scribe has used red pen and matter have been written in black. On few pages in the beginning, couplets and quatrains have been covered with red signs that lacks on subsequent pages. After its completion mistakes of scribe have rectified either by his master or himself e.g some names like Abu Nasr Jannati or list of books of Ibn-i-Sina were scribed by black pen, later underlined by red one.

Well-known scribes used to attest their signature or name on colophons or in case if it is holograph, author used to write (نسخہ بدست مولف/بید مولف کتابت شدہ)or would attach the sign of "١٤" over the name which certifies manuscript to be holograph. Such statement elevates the value of manuscript but sadly neither the name of scribe nor a line is there which could provide clue about the scribe.

Tazkira-i-ilahi is alphabetically arranged but paratext and first leaf are obsolete. As per the list provided by Professor Abdul Haq, the anthology starts with the records of Abu Ali Sina which lies on 11th page whilesecond page starts with the quatrains of Sheikh Abu Saeed AbulKhair,which concludes his biography and have been mentioned as an example of his quatrains. Moreover alphabetically Abu Saeed is prior to Abu Ali Sina. On the basis of these two speculations it can be ascertained that the biography of Sheik Abu Saeed AbulKhair was recorded on first flyleafand it was first entry. Name of Abu NasrJannati has been scribed with black pen on the same page that is underlined with red one.Last entry in the anthology is of Yusuf Bin Sheikh Ahmad Jaami after that the scribe has provided a colophon which states announces conclusion of classical poets and date of completion.

Chronologically it starts from Sassanid dynasty and biography of only two monarchs from this period comprising Sherwan Sassanid and BahramGur has been dealt with. Poets from Tahirid and Saffarid dynasty have been superficially focused,whereasGhaznavid and Seljuq Empire

seemingly have been area of Mir Ilahi's interest and considerable biographies of poets, mystics, theologians have been lucidly discussed. More or less one hundred and fifty writers, chronicles and poets belongs to the era of great Seljuqs.

This anthology is very inclusive and it also covers biographies from other minor dynasties of Persia like Zyarid, Dailamite, Khwarezmian, Kurts and Afrasiab. Invasion of Gingiz Khan and his successors and biographies of their patronized poets and chronicles covers major part of this anthology. The latest poet from Persian dynasties is JamaliSimkash, who belongs to Amir Timor's period.

From Indian subcontinent biography of Sultans like AlauddinJahansoz has been discussed. Chain of mystics from Chisti order like KhwajaMoinuddinChishti, QutubuddinBakhtyar Kaki, Sheikh NizamuddinAuliyaetc, who have been transcendental mentor of Sultans and poets, has been vividly focused and biographies of Indian-Persian poets like Tajuddin Reza, ShahabMehmara, HasanDehlavi have been recorded.

BadruddinShaasti is the latest poet from Indian subcontinent who lived during the reign of Mohammed Bin Tughlaq (725 to 752 A.H)

From leading female poets, biography of RabiabintKa'bKhuzdari has been written. MutribaSamarqandi and BibiMasti are other female poets whose biography have been covered in this anthology.

During the medieval period Sabk-i-Hindi was widespread among Indo-Persian poets, chronicles and anthologists. Sabk-i-Hindi is all about beautifying and ornamenting language with selected allusion and similes. Around all poetschronicles and anthologists had adopted this genre but Mir Ilahi seems to isolate himself from the trend and uses very simple and versatile language. Usage of Arabic words, plenty of fabricated lines have been avoided in Tazikra-i-ilahi.

Mir Ilahi was a poet turned anthologist, at some places his poetic spirit overcomes and writings looks to be inspired by poetic expression. Ilahi often uses rhyming tunes which impartially sheds light upon his elevated poetic skills. He introduces every individual with rhyming words and immense reverence. Throughout the anthology poetic terms such as allusion, simile, insinuation, and articulation can be evidently noticed that has been resulted by his poetic tendency.

Despite all privileges and preferences,persona of Mir Ilahi has been sufficed on few lines therefore one finds out differences in his parentage and birth place. Journey of Ilahi from Hamdan to Shiraz and India via

Isfahan is has been murkily narrated and often reader confronts vagueness. Tazkira-i-ilahi can be a useful mean to attain detail of his personal life. Ilahi recalls his three and half years stay in Shiraz in 1010 A.H. and first attempt to accumulate information pertaining to Persian poets. Also he notes down the incident of drinking wine at the age of thirty in India[4]. Amid the biography of Farrukhi,he acknowledges to have authored a explanatory treatise on Diwan of Farrukhi[5] and time by time also attaches his own couplets or quatrains related to the topic.

Mir Ilahi was an honest anthologist who always gives reference of his source to validate provided information of accounts. He often quotes the name of sources and has used around 25 books including History, Anthology and Treatise. Due to lack of resources he relied onLobabul-Albab and Arafat-ul-Ashiqin and excessively gives their reference which meekly reveals lack of research. Reliance on others has also refrained him from rendering unique or rare information therefore it is weak in terms of substance.

There are many aspects which indicates lack of resource and research as well. Accounts of many prominent poets from different periods are obsolete. Biography of towering writers such as Al Biruni, famous Indologist andleading historian Mohammed JarirTabri have not been discussed.As mentioned earlier that apart from Iranian poets, records of Inod-Persian also have been included in it butAmir Khusraw, disciple of HazratNizamuddinAwliya and companion of HasanDehlavi, who stands unequalled among all contemporaries, is not recorded.

In case of confusion or contradiction, Mir Ilahi compares sources, brings both statement together and leaves the judgment on readers. He seldom gives his own verdictfor example TaqiAwhadi introduces a poet named Moizzi who lived during Ghaznavid Period, Ilahi rejects his opinion with evidences and points out misunderstanding ofAwhadi[6].

There are signs which indicate that even first volume was not entirely complete or probably scribe skipped few lines. Only name ShaqeeqBalkhi without any word about his persona, is written by red pen and from next row another biography starts, Name of Sheikh Junaid Baghdadi which is amid the couplets and has not records, is written with red pen instead of black. Couplets of BehramGur was later added in margins in Shikashta font.

[4]Tazkira-i-ilahi (Berlin) P:120
[5]Tazkira-i-ilahi (Jaunpur) P:519
[6]Also P: 641

After going through Tazkira-i-ilahiit becomes evident that Mir Ilahi has quoted biographies of Sassanids, Tahirids, Safarids, and Samanid monarchs and poets from Tazkira-i-Daulat Shah. Records of Ghaznavid period have been wholly sourced upon only four books such are Lobabul-Albab, Tarikh-i-Yamini, Tarikh-i-Gozida and Tazkira-i-Daulat Shah. Due to relying on numerable resources leading poets of this period such as Asadi, Asjadi, AwhadiMuraghi and Ghazayerietc have been sufficed on few lines.

Biography of mystics such as Baba Tahir, Attaar, Khwaja Abdullah Ansari, Sheikh Najmuddin Kubra etc, have been discussed considerably.In this regard Nafhatul-Uns, of Maulan Jami and Tazkiratul-Awliyaof Attaarhave been chiefly sourced upon.Biographies from late sixth century have been sourced on Tarikh-i-Jahangusha, Habibus-Siyar, Rauzatus-Safa.Tabqat-i-Nasiri and Tarikh-i-Alfi are the two major sources for history of Indian subcontinent. Since they only deals with history this is why Mir Ilahi seems to be unable to introduce Indo-Persian poets. Other sources of Tazkira-i-ilahi are Tazkira-i-Dawlat Shah, Resalatul-Abrar, Mirsadul-Ebad, Tarikh-i-Yamini, Tarikh-i-Homayuni, Fihe-Ma-Fihe, CheharMaqala, NuzhatulQulub, Shiraz Nama, Tarikh-i-Baiheqi, Tarikh-i-Shah Rukhi, Tarikh-i-Yafei, Tarikh-i-Banakati and Nizamut-twarikh.

References:

1-Sprenger, catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani manuscripts of the libraries of the king of Nawab of Audh, Calcutta, 1854

2-Ilahi Hamdani, Tazkira-i-Ilahi,(Jaunpur)Natioanal mission for manuscripts, 2013

3-Ilahi Hamdani, Tazkira-i-Ilahi (Berlin)Natioanal mission for manuscripts, 2013.

4-Prof. Abdul Haq, Introduction to Tazkira-e-Ilahi,

5-AhmadGulchinMa'ni, Karvan-e-Hind, first edition, 1369, Mashad.

6-mohammed Awfi, Lobabul-Albab, Edited by E.G Browne, Cambridge.

7-Najaf Haider, Manuscript production and preservation in medieval India, Journal of Asiatic society, Volume, LII, No, 1, 2010

8-Dawlat Shah Samarqandi, Tazkiratush-Sho'ra, edited by E.G Browne 1382.

9-Ahmad GulchinMa'ni, Tarikh-i-TazkiraHaaye Farsi, KitabKhana-i-Senayi, 1363.

10- Mehdi Darakhshan, Buzorghaan o sukhansarayaan-e-Hamdan, Intesharat e ittela'at, Tehran 1374.

11- Molvi Agha Ahmad Ali Ahamad, Haft Aasman, Asiatic Society of Bengal 1873.

Sadaf Fatima

Research Scholar, Department of Philosophy

Aligarh Muslim University, Aligarh

PROBLEM OF EVIL IN MUSLIM PHILOSOPHY

(With Special Reference to Mohammad Iqbal and Al- Ghazali)

ABSTRACT

This paper sheds light on the treatment of the 'problem of evil' and human suffering from an Islamic perspective.

Throughout the ages the problem of evil has been discussed by philosophers and religious teachers of both the East and the West. The opposing forces, evil and good, are at war each other. We find this conflict everywhere in the universe, within us and outside us.

Problem of evil refers to the question of how to reconcile the existence of evil in the world with the existence of an omniscient (all-knowing), omnipotent (all-powerful), and perfectly good God. We believe that God created the world and He sustains it. God knows all things; God is perfectly good and wants only the best for his creation. If each of these claims is true though, then it is difficult to see why God allows evil in the world to persist. The evil in the world thus appears to be at least strong and perhaps even conclusive evidence that at least one of these central claims is false. An argument from evil attempts to show that the co-existence of evil and such that God is unlikely or impossible. Attempts to show the contrary have traditionally been discussed under the heading of theodicy. Besides philosophy of religion, the problem of evil is also important to the field of theology and ethics. Islam is a major world-religion which has swayed the minds and hearts of a large section of mankind. The fascinating elements of Islam are: (i) the passionate belief in one God without a second and one who is the Creator of the Universe, full of power, mercy and goodness, and (ii) the utter subservience of the human will to the Divine Will.

Prophet Muhammad never claimed to be more than a man. He felt an urge to lift up people from the quagmires of idol worship of one God. He exhorted the people that they must give up the worship of their numerous gods and follow the Will of God. He exhorted the people that they must give up the worship of their numerous gods and follow the will

of God. He preached simple but firm moral codes of kindness towards the poor and needy and loyalty to friends. He urged that they should devote their time in prayer and be sincere and faithful in their devotion to God.

The problem of evil acutely applies to monotheistic religions such as Christianity, Islam and Judaism that believe in a monotheistic God who is omnipotent, omniscient and omnibenevolent; but it has also non- theistic or polytheistic such as Buddhism, Hinduism and Jainism.

The conclusion of the paper will attempt to bring about a new understanding of how the so- called "problem of evil" is not presented in Islam as a problem but rather as an instruement in the actualization of God's plan, which is intertwined with human experiences in this world- an experience that is necessary for man's spiritual development.

Now we will discuss the problem of evil in Muslim Philosophy especially with Al- Ghazzali and Mohammad Iqbal.

Key Words: Mohammad Iqbal, Al- Ghazzali, Islam, Evil, Good, Qur'an, Suffering, God.

INTRODUCTION:

The existence of Evil is one of the oldest problems which has caused perplexity to the philosophers through all centuries from the earliest times. We find the question being asked over and over again, 'what is good and what is evil'. The another and most important difficulty is, if God created the world, or if he sustains, manages, or supervises, and if God is infinitely good, how shall we explain all the pain and evil, all the sin and sorrow and suffering, and the thwarted plans and disappointed hopes which are evident everywhere? If He could not prevent them, He is not God, if He could and does not, He is not good.

The abstract notion of good and evil began to be reflected upon since the time when man began to reflect upon himself. We find the discussion on this problem in the scriptures such as Rigveda, the bible and the Quran and as well as in the discourses of noted eastern and western philosophers. Even today it is the most burning problem. Thus we find that the problem of evil has been a most important and persistent one between the theologians and philosophers, especially among theistic philosophers. (Dagohert De Runes, 1942, 102).

MOHAMMAD IQBAL: Muhammad Iqbal was born at Sialkot (then in India and now Pakistan) in February, 1873. His English education began in his own town Sialkot where he got Syed Meer Hasan, a complete teacher who had his own culture and intellectual interest which had a

great impact upon Iqbal. He was educated at the Government College, Lahore after that where he received his M.A degree in Philosophy in 1899. At this early age, he demonstrated the qualities of a fine poet. In 1905 He went to Cambridge (England) and studied there Philosophy and Persian. In Germany, he obtained the PhD degree in 1908 on his thesis "The Development of Metaphysics in Persia." He came back to England where he became Bar- at- Law. He taught in Commerce College, London. In 1908, he returned to Lahore where he taught in Government College, Lahore for two years. Later on he started practicing law. Muhammad Iqbal died on April 21, 1938. (Khan Shareef, 1994, 119). Let us now discuss the conception of evil according to Mohammad Iqbal.

CONCEPT OF EVIL: The problem of suffering has also been referred to as the problem of evil in the history of human thought. Ever since man began reflect over God, soul and universe, this problem has agitated the minds of both the philosopher and the religious man alike. Some thinkers have reckoned the fact of positive presence of suffering in the universe. Others have tended to regard it as simply superficial, all the world being the pulsation of one divine delight. Still others have regarded this world and all it contains as unreal and illusory. Similarly, the solutions which have been suggested are also varied. Some thinkers stand for the struggle with the evil forces and believe in man's capacity to conquer these forces in the long run. These thinkers may be termed as meliorists or pragmatists. Others think that a right knowledge about God, man and universe will solve this problem automatically. They may be termed as optimists. Still other seeks the solution of the problem in the cessation of desires and the escape from the world. They may be termed as pessimists.

All the great religions of the world have got their own characteristic way of dealing with this problem of suffering. In this, we wish to present the Islamic point of view, particularly as represented by Mohammad Iqbal.

At the very outset, let us see the meaning which the word 'suffering' carries with it. It includes two types of suffering:

(a) Physical suffering such as storm, earthquakes, floods, droughts, famines, diseases and death;
(b) Suffering born of man's own conduct, such as mental suffering, frustration, pangs of repentance, the sense of failure and the sufferings born of wars, strifes and discords.

Next we have to see how the problem poses itself before man. The religious man who possesses a philosophical temperament, or a philosopher who possesses a religious bent of mind, naturally

finds the goodness and perfection of God as conflicting with the presence of evil in the world. He asks: Is the evil something alien and external to God? If so, being omnipotent, why does He not root out the evil which is just opposed to His essence and thus save man from much suffering? Or else, is He Himself the creator of the evil? If so, what can be the purpose of God in its creation?

Let us now proceed to understand the problem in the framework of Islam. According to Islam, the world and all it contains is real and possesses positive existence. And so is the case with the presence of suffering in this world. Iqbal finds the fact of moral and physical evil standing out prominently in the life of Nature and he sees something terribly positive about it.

Now, at this stage, two points figure out very prominently. First, according to the *Qur'an,* the world is not a cursed place where the elementally wicked humanity is imprisoned. On the contrary, the *Qur'an* regards the earth to be the 'dwelling place' of man and a 'source of profit' to him for the possession of which he ought to be grateful to God. Thus the *Qur'an* says:

And we have established you on the earth and given therein support of life.

How little do ye give thanks?

Secondly, whatever evil and suffering we find in the world is not the result of the original sin of Adam which may be infecting all the generations of man, past, present and future. The *Qur'an* is very clear on this point. It repeatedly emphasizes that every man will be held responsible for only that which he himself has done, and no man will share the burden of the sins of others.

Man is in the real world, and there exists suffering actually in the world he lives in. Now the problem is how to explain this suffering. Here it may be interesting to note Iqbal's interpretation of the legend of the fall of man referred to in the Old Testament as well as the *Qur'an.* For, he thinks, it will give some clue to the understanding of the problem of suffering. Iqbal has maintained that the legend of the fall of Adam from the paradise mentioned in the *Qur'an* has not been used to describe the first appearance of man on the surface of the earth. According to him, its "purpose is rather to indicate man's rise from a primitive state of instinctive appetite to the conscious possession of free self, capable of doubt and disobedience." Thus, Adam's first disobedience of God marks the conscious

realization of the possession of freedom of will choose good or evil. Free personality is, according to the *Qur'an*, God's trust with man. Now it is upon him to use this trust rightly or wrongly. The *Qur'an* makes its position clear regarding good and evil. It says:

> And for trial will we test you with evil and with good.

Dealing with the legend in question, Iqbal further remarks that the word 'Adam' has not been used to describe a particular concrete individual but the whole human race. His view is that it is highly probable that this legend "arose out of the primitive man's desire to explain to himself the infinite misery of his plight in an uncongenial environment, which abounded in disease and death and obstructed him on all sides in his endeavour to maintain himself."

According to Iqbal, the *Qur'an* has split the episode of the fall of Adam into two. The first episode relates simply to the 'tree' and the other relates to the 'tree of eternity' and the 'Kingdom that faileth not'. The first episode is mentioned in the 7th and the second in the 20th *sura* of the *Qur'an*. Interpretating the first episode, Iqbal, quoting the testimony of H.P. Blavatski, author of the *Secret Doctrine*, says:

> With the ancients the tree was a cryptic symbol for occult knowledge Adam was
>
> forbidden to taste the fruit of this tree obviously because his finitude as a self, his
>
> sense equipment and his intellectual faculties, were, on the whole, attuned to a
>
> different type of knowledge which necessitates the toil of patient observation and
>
> admits only of slow accumulation.

On the advice of Satan, Adam sought a short cut to knowledge by tasting the fruit. Iqbal thinks, therefore, that the only way to correct this tendency was to place him in an environment which, however painful, was better suited to the unfolding of his intellectual faculties. Consequently, Adam was sent to the painful physical environment so that man may have the joy of perpetual growth and expansion through enlarging the possibilities of his knowledge which enriches by the method of trial and error.

According to Iqbal, the purpose of the second episode is to describe man's desire to attain immortality through sexual reproduction. It is of life says to death: "If you sweep away one generation of living things, I will produce another". However, due to the emergence of multitudinous individualities, there issues forth an awful struggle for existence. Hence Iqbal holds the view that this "mutual conflict of opposing individualities, is the world pain which both illuminates and darkens the temporal career of life". The sufferings and other evils are, accordingly to him, the necessary accompaniment of the finitude of our 'self'. Iqbal says that the Qur'an regards true manhood as consisting in 'patience under ills and hardships'.

It has now become clear that there is the positive existence of suffering in the world. As to the reason of its presence, Iqbal says that at the present stage of human evolution, we cannot fully understand the purpose of the presence of suffering. However, he thinks that there can be no meaning behind it except that the driving power of suffering provides man with a discipline so that his self may become hardened and fortified against a possible dissolution. Iqbal's conclusion is this:

We cannot understand the full import of the great cosmic forces which work havoc,

and at the same time sustain and amplify life. The teaching of the Qur'an, which

believes in the possibility of improvement in the behavior of man and his control over

natural forces, is neither optimism nor pessimism. It is meliorism, which recognize a

growing universe and is animated by the hope of man's eventual victory over evil.

(Rafique, 1988, 16- 19).

AL- GHAZALI: Al- Ghazali, the philosopher and the theologians, has been judged by many to be the greatest among Muslims after the Prophet. He is certainly one of the greatest minds in the history of Islamic philosophy and theology and undoubtedly ranks with the greatest thinkers of the world. Long before Descartes he enunciated the method of doubt as a fruitful process of philosophical enquiry and propounded a theory of causation quite similar to that of Hume. In this general attitude he approaches Kant and Schleimacher. Prof. D.B. Macdonald in his

"Development of Muslim Theology- Jurisprudence and Constitutional Theory" plays a glowing tribute to him in these words, "The greatest, certainly the most sympathetic figure in the history of Islam and the only teacher of the after generations ever put by a Muslim on a level with the four great Imams".

His life and thought had, in fact, played a cardinal role in determining the spiritual values of Islamic Society. In his own person he took up the life of his time with all its problems. He lived through them and draws his philosophical and theological thought or system from his experience "Everything that he thought and wrote came with weight and reality of personal experience". (Macdonald, 1903, 215 & 216).

Al- Ghazali was born at Tus in 450/ 1058 when he was young his father died. His father's Sufi friend brought him up. He studied Theology, Cannon Law, Science, and Philosophy, Logic and the doctrines and practices of the Sufis. He lived in Sufi atmosphere and passed his after life as a follower of Imam- al- Herman. Through the Imam he stood in the Apostolic succession of Asharite teachers, being the fourth from the Ashari himself. There he remained till the death of Imam in 478. He was appointed as a teacher in 484 in Nizamia Academy at Baghdad, and there he was struck by a mysterious disease. His physicians said that his malady was mental and could only be mentally treated. He went to Mecca in 488. "This fight, for it was so in effect of Al- Ghazali, was unintelligible to the theologians of the time".

He was wandering in the labyrinth of his time. Since his youth he had been a skeptical and ambitious student playing with religious influences yet unaffected by them. But the hollowness of his life was ever present with him and pressing upon him. As a result of his skepticism his religious beliefs gave way and left him with the course of that time. At last, the strain became too great and he touched for two months the depths of absolute skepticism. He doubted the evidence of the senses; he could see plainly that they often deceived, for example, shadows move but man's eyes cannot perceive the movement. He doubted the primarily idea of the mind, the evidence of the senses, he could plainly that they often deceived, for example, shadows move but man's eyes cannot perceive the movement. He doubted the primary idea of the mind. Can a thing be or not be? "Perhaps he could not tell". When senses can deceive us there is no proof of the validity of mind. May be there is something the mind and transcending it. He also doubted revelation ecstasy and life after death etc. Thus he, for two months, became sceptic and thought no reasoning could help him. He had nothing from which he could begin. But at last he got

mercy of God and His light that followed in, and there was no need of reason for it. In this way this grace of God saved Ghazali and he regained the power to think. (Ibid, 221). Let us now discuss the conception of evil according to Al- Ghazali.

CONCEPT OF EVIL: Imam Al- Ghazali was a great theologian, a profound philosopher and a highly accomplished Sufi. As a theologian he did not deviate even as inch from the fundamental views of the recognized theologians of his age. He affirmed the arbitrariness of Divine action….God cannot be unjust in what He does, and cannot be wrong in thought what He decrees. "Fair seeming things are fair through His revelation and foul seeming things foul through His veiling, there are two attributes which persist in past eternity as they existed in pre-eternity"……..So that foul and fair are things whose nature, God has prescribed in pre- eternity. The clinging of heart to God and living a life of absorption in Him was the ideal before Al- Ghazali and also the supreme good for Him. Everything that seemed fair or foul was judged by this standard. (Umaruddin, 1964, 44)

Now with the consideration of this conception of ideal or the highest or supreme good, we have to examine the conception of evil in Ghazali's philosophical systems.

Evil may be categorized into four kinds such as metaphysical, physical, natural and moral. But Imam Ghazali discusses mainly the moral evil which he calls as "Shar".

Al- Ghazali, in accordance with the teachings of the Qur'an, believe that God is omnipotent to Him is due the primal origin of everything. It is He, the Creator who began the process of creation and adds to creation as He pleases.

On the question of Khair (good) and Shar (evil), Al- Ghazali finds himself on the horns of a dilemma. On the one hand God is represented as the disposer of everything.

He is the unmoved mover of the material world and the only efficient causes of all creation. Whatever happens in the heavens or on the earth happens according to a necessary system and predetermined plan. Not even a leaf can move without His decree. His law is Supreme everywhere. Whomsoever God wishes to guide, He expands His breast to Islam but whomsoever He wishes to lead astray He makes his breast light and straight. And on the other hand, man is shown to be responsible for his actions and for deserving place either in hell or in heaven. This implies complete moral freedom. (Sharif, 1959, 626).

Al- Ghazali seeks to reconcile both these tendencies on the basis of analysis of the human mind or human nature, freedom of will, ultimate end, knowledge, causation and grace etc.

HUMAN NATURE:

According to Al- Ghazali man has got two forms, "Khalq" (The physical form i.e. body) and Khulq (spiritual form). (Umaruddin, vol.I, part IV, 1962, 288). Khulq is the spiritual constitution of man. It is the essence of man which abides in his physical body and controls his organic and physical functioning. From this the actions proceed spontaneously and easily without much deliberation, hesitation and restraint on his part. It involves (1) a possession of action whether good or bad, (b) power over the action i.e. the actions are voluntary, (c) knowledge of the action, and (d) a state of the self which is equally inclined towards good or bad. (Ibid,Vol I, part II, 13).

But the state, when the Divine element is continuously struggling with the human evil tendency, which is denoted by the Qur'anic expression as Nafs al Lawwama (the admonishing soul), it is the equilibrium between them all that produces results which conduce to the realization of the ideal. (Ibid, vol I, part II,139).

We can say that things presented to the mind are of two types: (1) those our introspection or observation pronounces without deliberation as agreeable or disagreeable. No alternative is presented to the mind and (ii) those about which our reason hesitates to pronounce such a judgement. Here an alternative is presented to the mind and it has to make a selection. The example of the first is that of the movement of a needle towards our eyes. Here we know that the averting of the danger is advantageous and therefore we do not hesitate. On account of this knowledge our will is at once formed and our power is roused to act in order to avoid the needle and eye- lids are at once closed. Though this action is happened with intention, yet it was without hesitation and deliberation. Our actions where we have a choice are voluntary actions. In these cases reason hesitates and judgement is with old until we know whether the action which is to be executed is agreeable or not and we need to deliberate until the intellect decides in favour of acceptance or rejection.

This, however, is complex process during which the satanic element in man tries to repel its influence. The inherent strength of the instincts of appetition and self assertion, and tendencies formed by previous acts are factors which often disturb the balance of this conflict but when the intellect decides finally, it is followed by the will to execute

the actions. And the action will be executed unless there are any external hindrances in the way, e.g. sometimes the source of this will is to shake off this inertia. (Ibid, vol I, part II, 160).

In voluntary actions too will is produced by knowledge as it is produced in the first kind of action, therefore willing or not willing to do anything or knowledge of objects is must or essential.

Knowledge is one of the corner stone of Al- Ghazali's ethical system. Morality and good conduct are not possible without knowledge.

Intellect is found in all men through differing in intensity and scope. Initially intellect is a potentiality for the development of knowledge under conditions of experience and intuition. This knowledge has two aspects, viz. formal knowledge and existential knowledge. The former is the knowledge of the form in which the various objects of experience and intuition are apprehended. It is the knowledge of self evident principles.

Existential knowledge is the knowledge of the objects and events given in experience and intuition. It is of two kinds viz., phenomenal and spiritual. The knowledge of spiritual realities, e.g., God, soul etc is the highest form of knowledge. This knowledge depends upon intuition (Mukashafa) but it comes differently to different people. To some it comes through a good deal of self cultivation (Mujahida) while to few it is revealed directly. (Ibid, 143).

Knowledge serves a two- fold purpose. It is, firstly, an apprehension of objects and their significance; and secondly, a guide to conduct. Accordingly, intellect or reason is considered to have two aspects viz., theoretical and practical.

(i)Theoretical: It goes from the concrete to the abstract, from the particular to general, from the diversity to the unity, embracing wider and still wider fields under one principle as it advances. It too takes up towards the transcendental world and receives knowledge from it much as knowledge of God, His attributes, His actions, His angels, the mysteries of creation etc. Intuition is nothing but theoretical reason working at a higher plane.

(ii) Practical: Practical reason is the hand made of theoretical reason. It receives from theoretical reason its ennobling influence. But its active function lies in the domain of human conduct. It gives direction to voluntary individual acts. An individual acts of a saint or a patriot or an artist is guided by ideals conceived by theoretical reason, which influence

the practical reason in most of its decision in individual acts. Moreover, in opposition to reason which works for construction there is in the self a satanic element which works for destruction. Therefore, it is essential that all human faculties should remain under the absolute away of practical reason, for when it loses its supremacy over them, there follows the work of human character. (Ibid, 148).

CONCLUSION:

One can conclude that evil is a problem, not because there is evil in the world or that there is so much of it in the world. The problem is not found in the lack of balance between good and evil in the world. The problem comes from the facts that if there is a deity that is all good, all knowing and powerful, how can evil exist?

Human moral agents, not God, are the cause of evil. God is not responsible for the moral evil and in some sense created a world in which it is preferable that moral evil exists rather than it does not exist or even be a possibility. By looking at some area it is possible to form our own response to this problem of the existence of suffering and evil.

The painful problem of evil that is really the crux of theism, as Iqbal says, has been the most notorious problem for all theologians, especially for the monotheistic ones. It has been a canker in the heart of theism. All religion and all great literature and art may be seen as attempts to respond to the existence of evil.

Evil, antithesis of good. The philosophical problem of evil is most simply stated in the question, why does evil exist in the world? Death, disease, and sin are often included in the problem. “In the beginning, God created the heavens and the earth…..and God saw all that he had made, and behold, it was very good”. So why are things so messed up today? Well, sin entered into the world. But that doesn’t really the answer the question. If evil entered the world through Adam and Eve’s sin it doesn’t account the devil.

Al- Ghazali basically discusses the moral evil. In according to Qur’an Ghazali said that God is omnipotent and He is the primal origin of everything. On the question of Khair (good) and Shar (evil), Al- Ghazali finds himself on the horns of a dilemma: If God is all powerful, why does He allow sin to hurt so many innocent people? Why does he allow sin to hurt so many people? Why does the drunk driver walk away from the accident that kills the innocent child? Why do bad things happen to good people? If God is good, why doesn’t he stop it? May be He can’t. But if God is not all powerful, how can He be God?

To the present day, all theodicies have failed to explain why a good God would create evil, meaning that the existence of evil is simply incompatible with the existence of a good God.

BIBLIOGRAPHY:

1. Smith, Huston (1990), "*Primordialist Claim*" in God *Self and Nothingness: Reflections Eastern and Western*. Ed Robert E. Carter Paragon: New York.

2. Iqbal, M., (1997*) The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Ed. and Annot. by Mohammad Saeed Sheikh, Adam Publishers and Distributors, Delhi.

3. Umaruddin, M., (1962) *The ethical Philosophy of Al- Ghazali*, Aligarh Muslim University, Aligarh.

4. Macdonald, D.B, (1903) *Development of Muslim Theology Jurisprudence and Constitutional Theory*, Charles Scribner's Sons, New York.

5. Al- Ghazali, (1964) *Mizan al Amal,* Edit by Dr. Suliman, Cairo:Dar'al Marif.

6. Rafique, M., (1988) *Indian and Muslim Philosophy*, Ashish Publishing House, New Delhi.

7. Islam, N.A., (1987) *The Nature of Self, Suffering and Salvation*, Vohra Publishers and Distributors, Allahabad- India.

8. Khan, M.S & Saleem M.A., (1994) *Muslim Philosophy and Philosophers*, Ashish Publishing House, Delhi.

9. Ahmad Kamali, Sabih, (1963) *Al-Ghazali's Tahafut al-Falasifah,* Lahore: Pakistan

Philosophical Congress.

10. Black Antony, (2001) *The History Of Islamic Political Thought from The Prophet to*

the Present, Edinburgh University Press, 2001

11. Burrell. D and Daher. N, (1992) *The Ninety-Nine Name of God in Islam,* Cambridge:

The Islamic Texts Society.

12. Carole Hillenbrand, (1999) *The Crusades: Islamic Perspectives*, Edinburgh: University

Press.

13. Edoardo Albert, (2012) *Imam Al-Ghazali: A Concise Life*, United Kingdom: Kube

Publishing.

14. Fakhry Majid, (1970) *A History Of Islamic Philosophy*, New York: Columbia

University Press.

15. Hodgson, M. G. S., (1974) *The Venture Of Islam*, Chicago: The University Of Chicago

Press.

Dr. Md. Irshad Alam
(Project Fellow)
Institute of Persian Research,
Aligarh Muslim University,
Aligarh, 202002, UP,
India

A brief survey of Tarikh-i-Farah Bakhsh (Tarikh-i-Faiz Bakhsh) by Munshi Shiv Prashad.

The Eighteen Century of India was very significant as far as the Persian language is concern as well as history of Indian Navvab's. It is true that the culture of this language has to suffer an enormous change after death of Aurangzeb, yet in the light of quality and quantity of the prose works and notes produced by both Muslim and Hindu writers like *Sujan Rai Bhandari, Mohammad Ameen Qazwaini, Rai Bindaraban Das, Bakhtiyawar Khan, Shiv Prashad and Isar Das Nagar* hold an unique position in the history of Persian literature in India for their dynamic works. The period is particularly remarkable for its Epistolographical works. These people both Hindu and Muslim who excelled in the field of Historiography, Epistolography, Poetry, and Transliteration and so on, they have deep knowledge of Persian language and literature and they produced fine brand of literary works during that period which is still now found in the manuscripts available in India and abroad. They all are proficient in Persian and they had to negotiate as well as issue letters, orders and Firmans on behalf of their Navvab's. The contribution made by Shiv Prashad in the history of Rohilla Afghan's was remarkable as

well as Persian language and literature and the Indo- Persian language and literature is concerned. Most of these writers confined their works to the completion of general histories of the world in India like *Khulsat-ut-Tawarikh, Tawarikh-i-Dilkhusa, and Tawarikh-i-Shah Alam* and so on. The *Safar Nama* which throws light on the socio- economic condition of the period.

History remembers the Kings/Navvab's but there are some name which will be remembered for their notable works during the particular period. Earlier in ancient times king's and Navvab's appoint a particular munshi to write history of his own period so that the coming generations will know about his works and glory. At the time of Afghan chiefs of kather or Rohilla there was a person name ***Shiv Prashad***

وصف تعریف کتاب۔ تمهید تصنیف این مزخرفات اینست که راقم السطور اصنف العباد شیو)

(پرشاد بموجب اجازت و ارشاد خداوند نعمت بهادر پیش نواب امتیازالدوله رستم الملک۔

He was in the service of Rohilla Chief Navvab Faiz-Ullah or known as ***Faiz Baksh*** Fyzabadi who employed him as agent in his negotiations with Colonel in command of the British force at Bilgram. There Mr. Shiv became acquainted with Mr. Krik Patrick at whose request he wrote the situation of Afghans and the glory of their battles. He completed the work in the month of Muharram, in 1776 and dedicated his work to Navvab to whom it was submitted for correction. This work is known as ***Farah Baksh*** and also known as ***Faiz Bakhsh*** (به تاریخ فرح

بخش مسمی ساخت).

There is another book ***Farah Bakhsh,*** A story of Fyzabad from 1179H/1765-6 to 1233H/1817-8 (Persian Literature,A Bio-Bibliographical survey by C.A.Storey,History,P.No.135) written by Mohammad ***Faiz Bakhsh*** with the same name. According to Persian Manuscript ***Farah Baksh*** or ***Faiz Baksh*** it is also known as ***Tarikh-i-Afaghana*** (کتاب هذا مسمی به فرح بخش معروف به تواریخ افاغنه تصنیف منشی شیو پرشاد بخط بنده ارادت استمال شب لال در عهد ریاست نواب مستطاب معلی القاب فیاض زمان نواب احمد علی خان صاحب بهادر بن نواب محمد علی صاحب مرحوم بن نواب فیض احمد خان صاحب مغفور).

It was completed in 1190 H/1776 and copied by Shib Lal. This particular work is known as the history of Rohilkand and it discusses the history of Afghans who came to India. A history of Rohilla Afghans, their rise, independence and dissolution from the first foundation of their power to their defeat by Shuja ud-daula and the East India Company at Lal Dang in 1188 H /1774. The manuscript of this work is available in Raza library, Rampur, Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University, Aligarh, University of Punjab Lahor Pakistan and also available in The British Museum, England.

References;-

1. Awadh Ke Tarikh Nigar-, Anwar Husain Akbarpuri P.No.214.

2. Catalogue of Persian Manuscript of British Museum, Charles Rieu ,Voluem-I,P.No.306-7

3. *Persian Literature, A Bio-Bibliographical survey by C.A. Storey, Section II,P.No.695-6.*

4. Tawari-e-Farah Bakhsh or Faiz Bakhsh, Munshi Shiv Prashad, Folio No.7,8 and 156.

5. Tazkerah Murrekhin, Chaudhri Nabi Ahmad P.No.175

6. Cataloueg of the Persian Manuscripts in the Maulana Azad Library ,Aligarh Muslim University, Aligarh, by Dr. Athar Abbas Rizvi,P.No.127 and 135.